بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6973

سورۃ الانشقاق (84)

آیت نمبر (1 تا 9)

ك	د	ح

(ف) كَدۡحًا کسی کام میں بہت محنت کرنا۔ کسی چیز کے لیے تگ ودو کرنا۔
كَادِحٌ اسم الفاعل ہے۔ تگ ودو کرنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔6۔

ترجمہ

اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ۙ﴿۱﴾	وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّهَا
جب آسمان پھٹ جائے گا	اور وہ کان دھرے گا اپنے رب (کے حکم) کے لیے

وَ حُقَّتۡ ۙ﴿۲﴾	وَ اِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ ۙ﴿۳﴾	وَ اَلۡقَتۡ مَا فِیۡهَا
اس ہال میں کہ وہ اس لائق کیا گیا	اور جب زمین دراز کی جائے گی	اور وہ ڈال دے گی وہ جو اس میں ہے

وَ تَخَلَّتۡ ۙ﴿۴﴾	وَ اَذِنَتۡ لِرَبِّهَا	وَ حُقَّتۡ ۵
اور خود خالی ہو جائے گی	اور وہ کان دھرے گی اپنے رب (کے حکم) کے لیے	اس حال میں کہ وہ اس لائق کی گئی

یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ	اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰی رَبِّكَ	كَدۡحًا
اے انسان	یقیناً تو تگ ودو کرنے والا ہے اپنے رب کی طرف	جیسا تگ ودو کرنے کا حق ہے

فَمُلٰقِیۡهِ ۚ﴿۶﴾	فَاَمَّا مَنۡ	اُوۡتِیَ كِتٰبَهٗ	بِیَمِیۡنِهٖ ۙ﴿۷﴾
پھر ملاقات کرنے والا ہے اس سے	پس وہ جو ہے جس کو	دی گئی اس کی کتاب	اس کے داہنے ہاتھ میں

فَسَوۡفَ یُحَاسَبُ	حِسَابًا یَّسِیۡرًا ۙ﴿۸﴾	وَّ یَنۡقَلِبُ اِلٰۤی اَهۡلِهٖ	مَسۡرُوۡرًا ؕ﴿۹﴾
تو جلد ہی اس سے حساب لیا جائے گا	ایک ہلکا سا حساب	اور وہ لوٹے گا اپنے گھر والوں کی طرف	خوش کیا ہوا ہوتے ہوئے

نوٹ: 1

زمین کے پھیلا دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ سمندر اور دریا پاٹ دیئے جائیں گے، پہاڑ ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیئے جائیں گے اور زمین کی ساری اونچ نیچ برابر کر کے اسے ایک ہموار میدان بنا دیا جائے گا۔ سورہ طٰہٰ میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ایک چٹیل میدان بنا دے اجس میں تم کوئی بل اور سلوٹ نہ پاؤ گے۔ (آیات۔106۔107)۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ زمین ایک دستر خوان کی طرح پھیلا کر بچھا دی جائے گی۔ پھر انسان کے لیے اس پر صرف قدم رکھنے کی جگہ ہوگی۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے یہ حقیقت نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اس دن تمام انسانوں کو جو روز آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہوں گے، بیک وقت زندہ کر کے عدالت الٰہی میں پیش کیا جائے گا۔ اتنی بڑی آبادی کو جمع کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ سمندر، دریا، پہاڑ، جنگل، گھاٹیاں اور پست و بلند علاقے سب کے سب ہموار کر کے کرۂ زمین کو ایک میدان بنا دیا جائے تا کہ اس پر ساری نوع انسانی کے افراد کھڑے ہونے کی جگہ پا سکیں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

كَدْحٌ کے معنے کسی کام میں پوری جدوجہد اور اپنی توانائی صرف کرنے کے ہیں اور اِلٰى رَبِّكَ سے مراد اِلٰى لِقَاءِ رَبِّكَ ہے یعنی انسان کی ہر سعی اور جدوجہد کی انتہا اس کے رب کی ملاقات کی طرف ہونے والی ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو خطاب فرما کر اسے غور و فکر کے لیے ایک ایسی راہ دکھائی ہے کہ جس میں کچھ بھی عقل و شعور ہو تو وہ اپنی جدوجہد کا رخ صحیح سمت کی طرف پھیر سکتا ہے جو اس کو دنیا اور دین، دونوں میں سلامتی اور عافیت کی ضمانت دے۔

پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ انسان نیک ہو یا بد، مومن ہو یا کافر، وہ اپنی فطرت سے اس کا عادی ہے کہ کسی نہ کسی چیز کو اپنا مقصود بنا کر اس کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرے اور مشقت برداشت کرے۔ ایک نیک انسان اپنی ضروریات زندگی کی تحصیل میں جائز طریقوں کو اختیار کرتا ہے اور ان میں اپنی محنت و توانائی صرف کرتا ہے۔ ایک بدکار انسان بھی اپنے مقاصد کسی محنت اور جدوجہد کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا۔ چور، ڈاکو اور دھوکہ فریب سے لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کو دیکھو کسی کیسی ذہنی اور جسمانی مشقت برداشت کرتے ہیں جب ان کو ان کا مقصود حاصل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ انسان اگر غور کرے تو آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اس کی حرکات ہوں یا سکنات، وہ سب ایک سفر کی منزلیں ہیں جسے وہ غیر شعوری طور پر طے کر رہا ہے۔ اس سفر کی انتہا موت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری۔ اور یہ انتہا ایسی حقیقت ہے کہ جس کا کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان کی ہر جدوجہد کا موت پر ختم ہونا یقینی ہے۔ تیسری بات یہ بتلائی کہ موت کے بعد اپنے رب کے سامنے حاضری کے وقت تمام حرکات و اعمال اور جدوجہد کا حساب ہونا از روئے عقل و انصاف ضروری ہے تاکہ نیک و بد کا انجام الگ الگ معلوم ہو سکے کیونکہ دنیا میں اس کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ ایک نیک آدمی پورا مہینہ محنت مزدوری کر کے اپنا رزق اور جو ضروریات حاصل کرتا ہے، چور ڈاکو اس کو ایک رات میں حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی حساب اور جزا و سزا کا وقت نہ آئے تو دونوں برابر ہو گئے جو عقل و انصاف کے خلاف ہے۔

آخر میں فرمایا فَمُلٰقِيْهِ۔ اس کی ضمیر كَدْحٌ کے لیے بھی ہو سکتی ہے ایسی صورت میں معنی ہوں گے کہ جو بھی جدوجہد انسان یہاں کر رہا ہے اُن سے وہ اپنے رب کے پاس پہنچ کر مل لے گا۔ اور اس کے اچھے یا بُرے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مُلٰقِيْهِ کی ضمیر رب کے لیئے ہو۔ تو معنی ہوں گے کہ ہر انسان آخرت میں اپنے رب سے ملنے والا ہے اور اپنے کیے کا حساب دینے والا ہے۔ اس کے آگے نیک و بد انسانوں کے الگ الگ انجام کا ذکر ہے۔

اس سارے مجموعہ پر انسان اگر غور کرے کہ ضروریات زندگی اور مرغوبات نفس کو حاصل تو نیک و بد دونوں ہی کر لیتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح دنیا کی زندگی دونوں کی گزر جاتی ہے مگر ان دونوں کے انجام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک کے نتیجہ میں کبھی نہ ختم ہونے والی راحت ہی راحت ہے اور دوسرے کے نتیجہ میں کبھی نہ ختم ہونے والی مصیبت اور عذاب ہے۔ پھر کیوں نہ انسان اس انجام کو آج ہی سوچ سمجھ کر اپنی کوشش اور عمل کا رخ اس طرف پھیر دے جو دنیا میں بھی اس کی ضرورتوں کو پورا کر دے اور آخرت کی دائمی نعمت بھی مل جائے۔

(معارف القرآن)۔

السلام وعلیکم رحمۃ اللہ وبرکاۃ

اللہ تعالیٰ ہم سب کی یہ سعی قبول فرمائے اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بنائے۔ جس جس نے بھی اس کار خیر میں مال، جان اور صلاحیتوں کو لگایا اللہ قبول و منظور فرمائے

انجمن خدام القرآن فیصل آباد میں اس کے فوٹو کاپی بھی دستیاب ہیں اور محترم ڈاکٹر جہاں زیب صاحب کے اس کتاب میں اضافہ جات کے ساتھ مطالعہ قرآن حکیم کے نام سے دستیاب ہیں

رابطہ کے لئے: info@khuddam-ul-quran.com ,www.khuddam-ul-quran.com

03217805614,0412437618,0412437781

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

2004

سورۃ الانشقاق (84)

آیت نمبر (10 تا 25)

و	س	ق

(ض) وَسَقًا کسی چیز کے متفرق اجزا کو اکٹھا کرنا۔ جمع کرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔17۔

(افتعال) اِتِّسَاقًا کسی چیز کے متفرق اجزا کا اکٹھا ہونا۔ جمع ہونا، اس طرح کہ وہ چیز پوری ہو جائے۔ کامل ہو جائے۔ زیر مطالعہ آیت۔18۔

ترجمہ

وَ اَمَّا مَنۡ	اُوۡتِیَ کِتٰبَہٗ	وَرَآءَ ظَہۡرِہٖ ۙ﴿۱۰﴾	فَسَوۡفَ یَدۡعُوۡا ثُبُوۡرًا ۙ﴿۱۱﴾
اور وہ جو ہے جس کو	دی گئی اس کی کتاب	اس کی پیٹھ کے پیچھے سے	تو جلد ہی وہ پکارے گا ہلاک ہونے کو

وَّ یَصۡلٰی سَعِیۡرًا ؕ﴿۱۲﴾	اِنَّہٗ کَانَ فِیۡۤ اَہۡلِہٖ	مَسۡرُوۡرًا ؕ﴿۱۳﴾	اِنَّہٗ ظَنَّ
اور وہ گرے گا آگ میں	بیشک وہ تھا اپنے گھر والوں میں	خوش و خرم	بیشک اس نے گمان کیا

اَنۡ لَّنۡ یَّحُوۡرَ ۚ﴿۱۴﴾	بَلٰۤی ۚ اِنَّ رَبَّہٗ	کَانَ بِہٖ بَصِیۡرًا ؕ﴿۱۵﴾
کہ وہ ہرگز واپس نہیں ہوگا	کیوں نہیں یقیناً اس کا رب	اس کو ہر حال میں دیکھنے والا تھا

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ﴿۱۶﴾	وَ الَّیۡلِ وَ مَا وَسَقَ ۙ﴿۱۷﴾
پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں شفق کی	اور رات کی اور اس کی جو اس نے اکٹھا کیا

وَ الۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ﴿۱۸﴾	لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ؕ﴿۱۹﴾	فَمَا لَہُمۡ
اور چاند کی جب وہ کامل ہوا	تم لوگ لازماً چڑھو گے ایک منزل پر ایک منزل سے	تو ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے

لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۲۰﴾	وَ اِذَا قُرِئَ عَلَیۡہِمُ الۡقُرۡاٰنُ	لَا یَسۡجُدُوۡنَ ۩﴿۲۱﴾
(کہ) یہ لوگ ایمان نہیں لاتے	اور جب پڑھ کر سنایا جاتا ہے ان کو قرآن	تو یہ لوگ سجدہ نہیں کرتے (السجدہ ۱۳)

بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُکَذِّبُوۡنَ ۬ۚ﴿۲۲﴾	وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ	بِمَا یُوۡعُوۡنَ ۬ۚ﴿۲۳﴾
بلکہ جنہوں نے انکار کیا وہ جھٹلاتے ہیں	اور اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہے	اس کو جو یہ محفوظ کرتے ہیں

فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۙ﴿۲۴﴾	اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا
تو آپؐ بشارت دیں ان کو ایک دردناک عذاب کی	سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے

وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	لَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ﴿۲۵﴾
اور عمل کیے نیکیوں کے	ان کے لیے ایک ایسا اجر ہے جو غیر منقطع ہے

نوٹ:1 آیات۔16 تا18۔ میں حق تعالیٰ نے چار چیزوں کی قسم کھا کر (یعنی شہادت کے طور پر پیش کر کے۔ مرتب) انسان کو پھر2004 اس چیز کی طرف متوجہ کیا ہے جس کا ذکر اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ میں آچکا ہے۔ یہ چاروں چیزیں جن کی قسم کھائی ہے اس مضمون کی شاہد ہیں جو جواب قسم لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ میں آنے والا ہے کہ انسان کو ایک حال پر قرار نہیں ہے۔ اس کے حالات اور درجات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ پہلی چیز شفق ہے یعنی وہ سرخی جو آفتاب غروب ہونے کے بعد افق مغرب میں ہوتی ہے۔ یہ رات کی ابتداء ہے جو انسانی احوال میں ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے کہ روشنی جارہی ہے اور تاریکی کا سیلاب آرہا ہے۔ دوسری رات کی قسم ہے جو انقلاب کی تکمیل کرتی ہے۔ تیسری قسم ان چیزوں کی ہے جن کو رات اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ یعنی وہ چیزیں جو دن کی روشنی میں منتشر پھیلی رہتی ہیں، رات کے وقت وہ سب سمٹ کر اپنے اپنے ٹھکانوں میں جمع ہو جاتی ہیں اور انسان، چرند و پرند، سب اپنے اپنے گھروں اور گھونسلوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ کاروبار کے پھیلے ہوئے سامان کو سمیٹ کر یکجا کر دیا جاتا ہے۔ یہ عظیم انقلاب خود انسان اور اس کے متعلقات میں ہے۔ (یعنی اسی طرح انسان بھی اپنے ''وطن'' یعنی جنت سے نکل کر اس دنیا میں منتشر پھرتا رہتا ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد اس کو اس کے وطن کی طرف واپس سمیٹ لیا جاتا ہے۔ مرتب)۔ چوتھی قسم جس چیز کی کھائی گئی وہ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ہے۔ اس میں چاند کے مختلف اطوار کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے ایک نہایت خفیف قوس کی شکل میں ہوتا ہے۔ پھر اس کی روشنی روزانہ کچھ ترقی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بدر کامل ہو جاتا ہے۔ مسلسل اور پیہم انقلاباتِ احوال پر شہادت دینے والی چار چیزوں کی قسم کھا کر حق تعالیٰ نے فرمایا نے فرمایا۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ یعنی انسان اپنی تخلیق کی ابتدا سے انتہا تک کسی بھی وقت ایک حال پر نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے وجود پر تدریجی انقلابات آتے رہتے ہیں۔

طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ کی تفسیر حضرت جابر بن عبداللہؓ نے خود رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے۔ یہ طویل حدیث قرطبیؒ نے اور ابن کثیرؒ نے مفصل نقل کی ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ انسان نطفہ سے منجمد خون بنا۔ پھر اس سے ایک مضغۂ گوشت بنا۔ پھر اس میں ہڈیاں پیدا ہوئیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا اور اعضاء کی تکمیل ہوئی۔ پھر اس میں روح لا کر ڈالی گئی اور وہ ایک زندہ انسان بنا جس کی غذا بطن مادر کے اندر رحم کا گندا خون تھا۔ نو مہینے کے بعد اللہ نے اس کے دنیا میں آنے کا راستہ آسان کر دیا اور گندی غذا کی جگہ ماں کا دودھ ملنے لگا۔ دنیا کی وسیع فضا اور ہوا دیکھی، بڑھنے اور پھلنے پھولنے لگا۔ دو برس کے اندر چلنے پھرنے اور بولنے کی قوت بھی حرکت میں آئی۔ ماں کا دودھ چھوٹ کر اس سے زیادہ لذیذ اور طرح طرح کی غذائیں ملیں، کھیل کود اور لہو و لعب اس کے دن رات کا مشغلہ بنا۔ کچھ ہوش و شعور بڑھا تو تعلیم و تربیت کے شکنجے میں کسا گیا۔ جوان ہوا تو جوانی کی خواہشات نے ان کی جگہ لے لی اور ایک نیا عالم شروع ہوا۔ نکاح، شادی، اولاد اور خانہ داری کے مشاغل دن رات کا مشغلہ بن گئے۔ آخر یہ دور بھی ختم ہونے لگا۔ قویٰ میں ضعف پیدا ہوا، بیماریاں آئے دن رہنے لگیں، بڑھاپا آ گیا اور اس جہاں کی آخری منزل یعنی قبر تک پہنچنے کے سامان ہونے لگے۔ یہ سب چیزیں تو سب کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ کسی کو ان سے انکار کرنے کی مجال نہیں۔ مگر حقیقت سے ناآشنا انسان سمجھتا ہے کہ یہ موت اور قبر اس کی آخری منزل ہے اور آگے کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو خالق کائنات ہے اور علیم و خبیر ہے، اس نے آگے آنے والے مراحل کو اپنے انبیاء کے ذریعہ انسان تک پہنچایا کہ قبر تیری آخری منزل نہیں بلکہ یہ صرف ایک انتظار گاہ (ویٹنگ روم) ہے۔ آگے اس سے بھی بڑا ایک جہان آنے والا ہے۔ اس میں ایک بڑے حساب کتاب کے بعد انسان کی آخری منزل مقرر ہو جائے گی جو یا دائمی راحت ہوگی یا پھر دائمی عذاب کی۔ اور اس آخری منزل پر ہی پہنچ کر انسان انقلابات کے چکر سے نکلے گا۔

ان آیات میں انسان کو اس کی تخلیق اور دنیا میں اس کو پیش آنے والے حالات وانقلابات سامنے کر کے یہ ہدایت دی کہ عقلمند انسان کا کام یہ ہے کہ دنیا میں اپنے آپ کو مسافر سمجھے اور اپنے وطن اصلی کے لیے سامان تیار کرنے اور بھیجنے کی فکر کو ہی دنیا کا سب سے بڑا مقصد بنائے۔ پھر فرمایا کہ ان تمام روشن ہدایات کے باجود بہت سے لوگ اپنی غفلت سے باز نہیں آتے۔ ایسے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اس کے سامنے جھکتے ہیں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

حق تو یہ تھا کہ جب قرآن ان کو ایسی عظیم حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے تو اس کو سننے کے بعد اس کی عظمت کے اعتراف میں اپنے رب کے آگے سجدہ میں گر پڑتے لیکن اس کے برعکس وہ اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہاں اہل عرب اور اہل مصر کی یہ روایت پیش نظر رہے کہ جب وہ کسی بات کی عظمت اور صداقت کا جوش وجذبہ کے ساتھ اعتراف کرنا چاہتے تو اس کو دیکھتے یا سنتے ہی سجدے میں گر پڑتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے فرعون نے جن ساحروں کو اکٹھا کیا تھا انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت اور ان کے معجزات کی عظمت کا اعتراف اسی طرح کیا تھا۔ عرب کے مشہور شاعر لبید کے قصیدے کے ایک شعر پر بھی اس وقت کے مشہور شعراء عرب نے سجدہ کیا جس کی بنا پر اس کا قصیدہ خانۂ کعبہ پر آویزاں کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ قرآن اپنی بلاغت وصداقت میں ان چیزوں سے بدرجہا بلند ہے لیکن جو لوگ اس کی قدر و قیمت سے ناآشنا تھے (اور ہیں) وہ اللہ کو سجدہ کرنے کے بجائے اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ (تدبر قرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البروج (85)

آیت نمبر (1 تا 10)

ترکیب

(آیت۔4) یہ ہم بتا چکے ہیں کہ فعل ماضی میں دعا کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:72، نوٹ۔2) یہاں قُتِلَ ماضی مجہول کا بھی دونوں طرح ترجمہ ہوسکتا ہے۔ ہم دعائیہ ترجمہ کریں گے۔ (آیت۔5) اَلنَّارِ کی جر بتا رہی ہے کہ اس سے پہلے اس کا مضاف اَصۡحٰبُ محذوف ہے۔ یہ مرکب اضافی اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ کا بدل ہے، جبکہ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ صفت ہے اَلنَّارِ کی ہے۔ (آیت۔6) عَلَیۡہَا میں ھَا کی ضمیر اُخۡدُوۡدِ کے لیے بھی ہوسکتی ہے۔ اور اَلنَّارِ کے لیے بھی۔ (آیت۔7) وَھُمۡ عَلٰی میں واو حالیہ ہے۔

ترجمہ

وَالسَّمَآءِ	ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ۙ﴿۱﴾	وَالۡیَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۙ﴿۲﴾	وَشَاہِدٍ
قسم ہے آسمان کی	جو (سیاروں کی) منزلوں والا ہے	اور قسم ہے وعدہ کیے ہوئے دن کی	اور قسم ہے حاضر ہونے والے کی

وَّمَشۡہُوۡدٍ ؕ﴿۳﴾	قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ﴿۴﴾	النَّارِ	ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ﴿۵﴾
اور قسم ہے معائنہ کیے جانے والے کی	مارے جائیں خندقوں والے	اُس آگ (والے) جو	ایندھن والی ہے

اِذۡ ہُمۡ عَلَیۡہَا	قُعُوۡدٌ ۙ﴿۶﴾	وَّہُمۡ	عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ	بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ
جب وہ لوگ ان (خندقوں) پر	بیٹھنے والے تھے	اس حال میں کہ وہ	اس پر جو وہ لوگ کرتے تھے	ایمان لانے والوں کے ساتھ

شُهُوْدٌ ۝۷	وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ	اِلَّآ اَنْ	يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ	الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۸
حاضر رہنے والے ہوتے تھے	اوران لوگوں نے سزانہیں دی ان کو	سوائے اس (بات) کے کہ	وہ لوگ ایمان لائے اللہ پر	جو بالادست ہے حمد کیا ہوا ہے

الَّذِيْ لَهٗ	مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ	وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	شَهِيْدٌ ۝۹
وہ جس کے لیے ہی	زمین اور آسمانوں کی بادشاہت ہے	اور اللہ ہر چیز پر	موجود رہنے والا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا	الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ	ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا
یقیناً جن لوگوں نے مشکل میں ڈالا	ایمان لانے والوں کو اور ایمان لانے والیوں کو	پھر توبہ (بھی) نہیں کی

فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ	وَلَهُمْ	عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝۱۰
تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے	اور ان کے لیے ہی	شعلے کا عذاب ہے

نوٹ: 1

اس آیت۔1۔میں بروج سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک بڑے بڑے ستارے ہیں۔حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔بعض مفسرین نے بروج سے مراد قصور یعنی محلات لیے ہیں اور اس سے مراد وہ مقامات ہیں جو آسمان میں پہرے داروں اور نگراں فرشتوں کے لیے مقرر ہیں۔بعض متاخرین (بعد میں آنے والے) نے اس سے مراد وہ بروج بتلائے ہیں جو فلاسفہ کی اصطلاح ہے، جس میں کل آسمان کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کو ایک برج کہا جاتا ہے۔ان کا خیال یہ ہے کہ ثابت ستارے انہی برجوں میں اپنی اپنی جگہ مقیم ہیں۔اور سیارے حرکت فلک کے ساتھ متحرک ہوتے ہیں۔اور ان برجوں میں سیاروں کا نزول ہوتا ہے۔مگر یہ سراسر غلط ہے۔قرآن کریم سیاروں کو آسمانوں میں مرکوز نہیں قرار دیتا بلکہ سیارے کو اپنی ذاتی حرکت سے متحرک قرار دیتا ہے۔جیسا کہ سورۂ یٰسین میں ہے وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (اور وہ سب کے سب فلک میں تیرتے ہیں) فلک سے مراد یہاں آسمان نہیں بلکہ سیارے کا مدار ہے جس میں وہ حرکت کرتا ہے۔(معارف القرآن)

نوٹ: 2

اصحاب الاخدود سے کون مراد ہیں؟ مفسرین نے کئی واقعات نقل کیے ہیں۔لیکن صحیح مسلم، جامع ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں جو قصہ مذکور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے زمانے میں کوئی کافر بادشاہ تھا۔اس کے ہاں ایک ساحر رہتا تھا۔جب اس کی موت کا وقت قریب ہوا تو اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ایک ہوشیار اور ہونہار لڑکا مجھے دیا جائے تو میں اپنا علم اس کو سکھا دوں تا کہ میرے بعد یہ علم مٹ نہ جائے۔چنانچہ ایک لڑکا تجویز کیا گیا جو روزانہ ساحر کے پاس جا کر اس کا علم سیکھتا تھا۔راستہ میں ایک عیسائی راہب رہتا تھا جو اس وقت کے دین حق پہ تھا۔لڑکا اس کے پاس بھی آنے جانے لگا۔اور خفیہ طور پر راہب کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔اور اس کے فیض صحبت سے ولایت و کرامت کے درجے کو پہنچا۔ایک روز لڑکے نے دیکھا کہ کسی بڑے جانور (شیر وغیرہ) نے راستہ روک رکھا ہے جس کی وجہ سے مخلوق پریشان ہے۔اس نے ایک پتھر ہاتھ میں لے کر دعا کی کہ اے اللہ اگر راہب کا دین سچا ہے تو یہ جانور میرے ہاتھ سے مارا جائے۔یہ کہہ کر پتھر پھینکا جس سے اس جانور کا کام تمام ہو گیا۔لوگوں میں شور ہوا کہ اس لڑکے کو عجیب علم آتا ہے۔کسی اندھے نے سن کر درخوست کی کہ میری آنکھیں اچھی کر دو۔لڑکے نے کہا کہ اچھی کرنے والا میں نہیں۔وہ اللہ ہے۔اگر تو اس پر ایمان لے آئے تو میں دعا کروں۔امید ہے وہ تجھے بینا کر دے گا۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔یہ خبریں بادشاہ کو پہنچیں۔اس نے برہم ہو کر لڑکے کو مع راہب اور اندھے کے طلب کر لیا۔اور کچھ بحث کے بعد راہب اور اندھے کو قتل کر دیا۔لڑکے کے لیے حکم دیا کہ اس کو اونچے پہاڑ پر سے گرا کر ہلاک کر دیا جائے۔مگر خدا کی قدرت سے جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا واپس آ گیا۔پھر بادشاہ نے اسے دریا میں غرق کرنے کا حکم دیا۔وہاں بھی یہی ہوا کہ لڑکا بچ کر آ گیا اور جو گئے تھے وہ دریا میں ڈوب گئے۔آخر لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ میں خود اپنے مرنے کی ترکیب بتاتا ہوں۔آپ سب لوگوں کو ایک میدان میں جمع کریں۔ان

کے سامنے مجھ کو سولی پر لٹکائیں۔ اور یہ لفظ کہہ کر مجھے تیر ماریں ''بسم اللہ رب الغلام'' بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا اپنے رب کے نام پر قربان ہو گیا۔ یہ عجیب واقعہ دیکھ کر لوگوں کی زبان سے ایک نعرہ بلند ہوا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْغُلَامِ۔ لوگوں نے بادشاہ سے کہا کہ جس چیز کی روک تھام کر رہے تھے وہی پیش آئی۔ پہلے تو کوئی ایک دو مسلمان ہوتا تھا لیکن اب خلق کثیر نے اسلام قبول کر لیا۔ بادشاہ نے غصے میں آ کر بڑی بڑی خندقیں کھدوائیں اور ان کو آگ سے بھروا کر اعلان کیا کہ جو شخص اسلام سے نہ پھرے گا اس کو ان خندقوں میں جھونک دیا جائے گا۔ لوگ آگ میں ڈالے جا رہے تھے لیکن اسلام سے نہیں ہٹتے تھے۔ بادشاہ اور اس کے وزیر و مشیر خندقوں کے آس پاس بیٹھے ہوئے مسلمانوں کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

یہ بادشاہ جس کا ذکر اس قصہ میں ہے ملک یمن کا بادشاہ تھا جس کا نام حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یوسف ذونواس تھا۔ اس کا زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت سے ستر سال پہلے کا زمانہ تھا۔ اور یہ لڑکا جس کو ساحر کے پاس اس فن سیکھنے کے لیے بادشاہ نے مامور کیا تھا، اس کا نام عبداللہ بن تامر تھا۔ محمد بن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ یہ لڑکا جس جگہ مدفون تھا وہ جگہ کسی ضرورت سے حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں کھودی گئی تو اس میں عبداللہ بن تامر کی لاش صحیح سالم اس طرح برآمد ہوئی کہ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کا ہاتھ اس جگہ پر رکھا ہوا تھا، جہاں تیر لگا تھا۔ کسی نے ان کا ہاتھ اس جگہ سے ہٹایا تو زخم سے خون جاری ہو گیا۔ پھر ویسے ہی رکھ دیا تو بند ہو گیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس پر لکھا ہوا تھا اَللّٰہُ رَبِّیْ۔ (ابن کثیر)۔ ابن ابی حاتم کے حوالے سے ابن کثیرؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آگ کی خندق کا واقعہ دنیا میں ایک ہی نہیں، بلکہ بہت ملکوں اور زمانوں میں ہوئے ہیں۔ پھر ابن ابی حاتم نے ان میں سے تین کا خصوصیت سے ذکر کیا کہ ایک خندق یمن میں تھی، دوسری شام میں اور تیسری فارس میں تھی۔ مگر قرآن کریم نے جس خندق کا ذکر اس سورت میں کیا ہے وہ ملک یمن کی خندق ہے کیونکہ یہی عرب کے ملک میں تھی۔ (معارف القرآن، ص ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ سے ماخوذ)

آیت نمبر (11 تا 22)

ترکیب

(آیت۔ 11) اَلْفَوْزُ الْکَبِیْرُ مرکب توصیفی ہے۔ لیکن یہ ذٰلِکَ کا مُشَارٌ اِلَیْہِ نہیں ہے، بلکہ یہ اس کی خبر معرفہ ہے اور اس سے پہلے ضمیر فاصل ھُوَ محذوف ہے۔ پورا جملہ اس طرح ہے ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْکَبِیْرُ۔ (آیت۔ 15) اَلْمَجِیْدُ کی رفع بتا رہی ہے کہ نہ تو یہ اَلْعَرْشِ کی صفت ہے اور نہ ہی ذُوْ کا مضاف الیہ ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں یہ حالت جر میں اَلْمَجِیْدِ آتا ہے۔ اس کی رفع سے معلوم ہوا کہ یہ وَھُوَ الْغَفُوْرُ کے مبتدا ھُوَ پر عطف ہے یا یوں کہہ لیں کہ اس سے پہلے اس کا مبتدا ھُوَ محذوف ہے۔ (آیت۔ 16) فَعَّالٌ سے پہلے بھی اس کا مبتدا ھُوَ محذوف ہے۔ (آیت۔ 17) حَدِیْثُ کا مضاف الیہ اَلْجُنُوْدِ ہے، لیکن یہ آگے فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ کا مضاف نہیں ہو سکتا کیونکہ مضاف پر لام تعریف نہیں آتا۔ نیز یہ کہ فِرْعَوْنَ اور ثَمُوْدَ دونوں غیر منصرف ہیں۔ اس لیے ان کی یہ حالت نصب بھی ہو سکتی ہے اور حالت جر بھی۔ لیکن یہاں ان کے نصب میں ہونے کی کوئی وجہ یا قرینہ یا قیاس موجود نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں یہ دونوں حالت جر میں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں بھی حَدِیْثُ کا مضاف الیہ ہیں۔ اس طرح یہ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ کا بدل بعض ہیں۔

2004

ترجمہ

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا	وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ	لَهُمْ جَنَّاتٌ	تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے	اور انہوں نے عمل کیے نیکیوں کے	ان کے لیے ہی ایسے باغات ہیں	بہتی ہیں جن کے نیچے سے

الْأَنْهَارُ ۚ	ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ﴿١١﴾	إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ	لَشَدِيدٌ ﴿١٢﴾
نہریں	یہ ہی سب سے بڑی کامیابی ہے	بیشک آپؐ کے رب کی گرفت	یقیناً بڑی سخت ہے

إِنَّهُ هُوَ	يُبْدِئُ	وَيُعِيدُ ﴿١٣﴾	وَهُوَ الْغَفُورُ	الْوَدُودُ ﴿١٤﴾
حقیقت تو یہ ہے کہ	وہ (ہی) ابتدا کرتا ہے	اور وہ (ہی) لوٹائے گا	اور وہ ہی بے انتہا بخشنے والا	انتہائی خیرخواہ ہے

ذُو الْعَرْشِ	الْمَجِيدُ ﴿١٥﴾	فَعَّالٌ	لِمَا	يُرِيدُ ﴿١٦﴾	هَلْ أَتَاكَ
جو عرش کا مالک ہے	وہ ہی عظیم الشان ہے	وہ کر گزرنے والا ہے	اس کا جس کا	وہ ارادہ کرتا ہے	کیا پہنچی آپؐ کے پاس

حَدِيثُ الْجُنُودِ ﴿١٧﴾	فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ﴿١٨﴾	بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا	فِي تَكْذِيبٍ ﴿١٩﴾
لشکروں کی بات	(جیسے) فرعون اور ثمود کی (بات)	بلکہ جنہوں نے انکار کیا وہ لوگ	جھٹلانے میں (پڑے ہوئے) ہیں

وَاللَّهُ	مِنْ وَرَائِهِمْ	مُحِيطٌ ﴿٢٠﴾	بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ ﴿٢١﴾
درآنحالیکہ اللہ	ان کے پیچھے سے (ان کو)	گھیرنے والا ہے	بلکہ وہ ایک ایسا عظیم الشان قرآن ہے جو

فِي لَوْحٍ	مَحْفُوظٍ ﴿٢٢﴾
ایک ایسی تختی میں (لکھا ہوا) ہے جو	محفوظ کی ہوئی ہے

نوٹ:1 اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کے بعد سابقہ آیات میں کافروں کو جو دھمکیاں دی گئی ہیں، ان کو مزید موکدّ اور مدللّ کرنے کے لیے آیات۔ 12 تا 16۔ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کچھ مزید صفات کی یاد دہانی کرائی ہے۔ اور ان دھمکیوں کو حقیقی ثابت کرنے کے لیے آیات۔ 17۔ 18۔ میں تاریخی حقائق کی طرف اشارہ فرما دیا۔ پھر ان میں سے قوم ثمود اور فرعون کا ذکر خاص اہتمام سے فرمایا ہے۔ قریش کے لیڈروں پر ان دونوں قوموں کی عظمت وشوکت کی بڑی دھاک تھی۔ ان کی طرف اشارہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھ لو، جب خدا نے ان کو پکڑا تو چشم زدن میں وہ صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ (تدبر قرآن ،ص ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ سے ماخوذ)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

سورۃ الطارق(86)

آیت نمبر(1 تا 17)

د ف ق

(ن) دُفُوْقًا پانی کا اُبل کر گرنا۔ اچھل کر بہنا۔

دَافِقٌ اسم الفاعل ہے۔ اچھل کر بہنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔6۔ 2004

ھ ز ل

(ن۔س) هَزْلًا لاغر و کمزور ہونا۔

(ض) هَزْلًا مذاق وٹھٹھا کرنا۔ بے نتیجہ یا لا حاصل بات کرنا۔

هَزْلٌ اسم صفت بھی ہے۔ کمزور۔ لاحاصل۔ بے نتیجہ۔ (جب یہ قول کی صفت کے طور پر آئے تو کمزور بات کا مطلب ہے ایسی بات جس کی کوئی سند یا دلیل نہ ہو اور لا حاصل بات کا مطلب ہے ایسی بات جس کا اچھا یا برا کوئی بھی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو۔ (زیر مطالعہ آیت۔14)

ترکیب

(آیت۔4) اس آیت میں اِنْ کو اِنْ مخففہ بھی مانا گیا ہے اور اِنْ نافیہ بھی۔ جو لوگ اسے اِنْ مخففہ مانتے ہیں وہ لَمَّا کو لَمَا (میم بغیر تشدید کے پڑھتے ہیں) اور لام کو اِنَّ کی خبر پر آنے والا لام تاکید مانتے ہیں اور مَا کو زائدہ مانتے ہیں۔ اور جو لوگ اسے اِنْ نافیہ مانتے ہیں وہ لَمَّا کو اِلَّا کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ ہم اِنْ نافیہ کے طور پر ترجمہ کریں گے۔ (آیت۔8) اِنَّهٗ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جبکہ رَجْعِهٖ میں ہٖ کی ضمیر اَلْاِنْسَانُ کے لیے ہے۔ (آیت۔13۔14) اِنَّهٗ میں هٗ اور مَا هُوَ میں هُوَ، یہ دونوں ضمیریں قرآن مجید کے لیے ہیں۔ فَصْلٌ اور اَلْهَزْلِ، یہ دونوں قولٌ کی صفت ہیں۔ اَلْهَزْلِ سے پہلے اَلْقَوْلِ محذوف ہے۔ یعنی پورا جملہ یوں ہے وَمَا هُوَ بِالْقَوْلِ الْهَزْلِ۔ لَقَوْلٌ فَصْلٌ مرکب توصیفی بن کر اِنَّ کی خبر ہے جبکہ (بِالْقَوْلِ) الْهَزْلِ مرکب توصیفی پھر مرکب جاری بن کر مَا نافیہ کی خبر ہے۔ اور یہ دونوں خبریں قرآن کے متعلق ہیں۔ (آیت۔17) مَهِّلْ باب تفعیل کا فعل امر ہے جس میں کام کو تدریجاً اور تسلسل سے کرنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا مطلب ہے تُو ڈھیل دیتا رہ۔ جبکہ باب افعال میں تدریج اور تسلسل کا مفہوم نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کے فعل امر اَمْهِلْ کا مطلب ہے تُو مہلت دے۔

ترجمہ

وَالسَّمَآءِ	وَالطَّارِقِ ۙ﴿١﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ	مَا الطَّارِقُ ۙ﴿٢﴾
قسم ہے آسمان کی	اور قسم ہے رات میں آنے والے کی	اور کیا سمجھا تو نے	کیا ہے رات میں آنے والا

النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿٣﴾	اِنْ كُلُّ نَفْسٍ	لَّمَّا	عَلَيْهَا حَافِظٌ ؕ﴿٤﴾	فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ
وہ چمکنے والا تارا ہے	نہیں ہے کوئی بھی جان	مگر نہ ہو	(کہ) اس پر ہے کوئی نگرانی کرنے والا	پس چاہیے کہ غور کرے انسان

مِمَّ خُلِقَ ؕ﴿٥﴾	خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ﴿٦﴾	يَّخْرُجُ	مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ؕ﴿٧﴾
کس چیز سے اس کو پیدا کیا گیا	وہ پیدا کیا گیا اچھل کر بہنے والے پانی سے	جو نکلتا ہے	پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے

اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ	لَقَادِرٌ ؕ﴿٨﴾	يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۙ﴿٩﴾	فَمَا لَهٗ	مِنْ قُوَّةٍ
بیشک وہ اس کی واپسی پر	یقیناً قدرت رکھنے والا ہے	جس دن جانچا جائے گا بھیدوں کو	تو نہیں ہو گی اس کے لیے	کوئی بھی قوت

وَّلَا نَاصِرٍ ؕ﴿١٠﴾	وَالسَّمَآءِ	ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ﴿١١﴾	وَالْاَرْضِ	ذَاتِ الصَّدْعِ ۙ﴿١٢﴾
اور نہ کوئی بھی مدد کرنے والا	قسم ہے آسمان کی	جو بارش والا ہے	اور قسم ہے زمین کی	جو دراڑ والی ہے

اِنَّهٗ	لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾	وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾	اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ	كَيْدًا ﴿۱۵﴾
بیشک یہ (قرآن)	یقیناً ایک فیصلہ کن بات ہے	اور یہ لاحاصل (بات) نہیں ہے	بیشک یہ لوگ چالبازی کرتے ہیں	جیسے چالبازی کرنے کا حق ہے

وَّاَكِيْدُ	كَيْدًا ﴿۱۶﴾	فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ	اَمْهِلْهُمْ	رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾
اور میں خفیہ تدبیر کروں گا	جیسے تدبیر کرتے ہیں	تو آپؐ ڈھیل دیتے رہیں کافروں کو	(یعنی) آپؐ مہلت دیں ان کو	غیر محسوس طریقہ سے

نوٹ:1

آیت۔4۔ میں حافظ سے مراد فرشتے ہیں جو ہر آدمی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کو بلاؤں سے بچاتے ہیں اور اس کے عمل لکھتے ہیں۔ اس کے لیے ستاروں کی قسم کھانے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ جس نے آسمان پر ستاروں کی حفاظت کے لیے سامان کیے ہیں، اس کو زمین پر تمہاری اور تمہارے اعمال کی حفاظت کرنا کیا دشوار ہے۔ نیز جس طرح آسمان پر ستارے ہر وقت محفوظ ہیں مگر ان کا ظہور شب میں ہوتا ہے، اسی طرح سارے اعمال نامۂ اعمال میں اس وقت بھی محفوظ ہیں مگر ان کا ظہور قیامت میں ہوگا۔ اس لیئے انسان کو قیامت کی فکر کرنا چاہیے اور اگر وہ اس کی بعید از قیاس سمجھتا ہے تو اس کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے بنا ہے۔ نطفہ سے انسان بنا دینا زیادہ عجیب ہے بہ نسبت دوبارہ بنانے کے۔ جب یہ عجیب بات اللہ کے حکم سے واقع ہو رہی ہے تو جائز نہیں کہ اس سے کم عجیب بات کے وقوع کا انکار کیا جائے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مومن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تین سو ساٹھ فرشتے اس کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں جو انسان کے ہر ہر عضو کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان میں سے سات فرشتے صرف انسان کی آنکھ کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں۔ یہ فرشتے انسان سے ہر ایسی لا و مصیبت جو اس کے لیے مقدر نہیں، اس طرح دور کرتے ہیں جیسے شہد کے برتن پر آنے والی مکھیوں کو پنکھے وغیرہ سے دور کیا جاتا ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ:2

آیات۔13۔14۔ کا مطلب یہ کہ یہ قرآن اور جو کچھ وہ قیامت کے متعلق بیان کرتا ہے، کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں ہے بلکہ حق و باطل کا دو ٹوک فیصلہ ہے۔ اس سے پہلے آیات۔ 11۔12۔ کی قسم کو اس بات سے یہ مناسبت ہوئی کہ قرآن آسمان سے آتا ہے اور جس میں قابلیت (یعنی حق کی طلب۔ مرتب) ہو اسے مالا مال کر دیتا ہے جیسے بارش آسمان سے آتی ہے اور عمدہ زمین کو فیضیاب کرتی ہے۔ نیز قیامت میں ایک غیبی بارش ہوگی جس سے مردے زندہ ہو جائیں گے جیسے یہاں بارش سے مردہ زمین سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:3

آیت۔17۔ میں کافروں کو مہلت دینے کی وجہ سے مفسرین نے یہ بتائی ہے کہ یہ لوگ اللہ سے بچ کر کہیں جا تو سکتے نہیں، اس لیے ان کو مہلت دو تا کہ یہ لوگ جو کرنا چاہتے ہیں وہ کر لیں اور ان پر اتمام حجت ہو جائے۔ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑنا تو ہے ہی، لیکن میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی کافروں کو ڈھیل دیتے رہنے کی ہدایت کو جب ہم عمومیت پر رکھ کر سوچتے ہیں تو اس ہدایت میں ہمیں اپنی رہنمائی کے کچھ اور پہلو بھی سمجھ میں آتے ہیں۔

اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر عقیدے اور مذہب کے مجرمین، اور ہر نوعیت کے مجرمین کو تا حیات مہلت ملی ہوئی ہے، اِلاَّ مَا شَاءَ اللّٰہ یہ بات اصولی طور پر بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کمرۂ امتحان میں طالب علم جب اپنا پرچہ حل کر رہے ہوتے ہیں تو کوئی طالب علم خواہ کتنا بھی غلط جواب لکھ رہا ہو، اس پر کوئی نہ روک ٹوک ہوتی ہے نہ کوئی گرفت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت ختم ہونے کی گھنٹی بجنے کے بعد جب اس سے کاپی لے لی جائے گی تب دیکھا جائے گا کہ اس نے کیا صحیح لکھا ہے اور کیا غلط۔ پھر اسی لحاظ سے اس کو نمبر ملیں گے۔

اس لیے گھنٹی بجنے تک ہر طالب علم کو مہلت ملی ہوئی ہے اور اسے آزادی (ڈھیل) بھی حاصل ہے کہ جو چاہے جواب لکھے۔ اس مہلت اور ڈھیل کا ایک مثبت پہلو بھی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ غلط جواب لکھتے ہوئے طالب علم کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور بھولا ہوا سبق یاد آ جاتا ہے تو وہ غلط جواب کاٹ کر اس کو اس کی جگہ صحیح جواب لکھ دیتا ہے۔ یہ سہولت اسے اس لیے حاصل ہوئی کہ گھنٹی بجنے سے پہلے پہلے اس پر کوئی روک ٹوک اور گرفت نہیں تھی۔

اسی طرح یہ دنیا ہماری زندگی کا کمرۂ امتحان ہے۔ موت کی گھنٹی بجنے تک ہماری مہلت ہے اور کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کی آزادی (ڈھیل) بھی ہم کو حاصل ہے۔ ہم کو یہ ڈھیل بھی حاصل ہے کہ جب چاہیں اپنا کوئی فیصلہ منسوخ کر کے اس کی جگہ کوئی نیا فیصلہ کر لیں۔ اس مہلت اور ڈھیل کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر خود اپنی اصلاح کرنے کا جو میکنزم رکھا ہے، اسے کام کرنے کا پورا پورا موقع ملے۔

البتہ ایک فرق ہے۔ طالب علم کے کمرۂ امتحان میں اس کے کچھ لکھنے یا نہ لکھنے کے فیصلے میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں ہوتی۔ لیکن زندگی کے اس کمرۂ امتحان میں انسان پر کوئی مشکل، کوئی مصیبت آتی رہتی ہے جو کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس طرح مداخلت ہوئی لیکن مہلت اور ڈھیل کی طرح یہ مداخلت بھی انسان کے حق میں مفید ہے۔ انسان کے اندر اپنی اصلاح کرنے کے میکنزم کی بیٹری کبھی اتنی ڈاؤن ہو جاتی ہے کہ وہ سلف اسٹارٹ نہیں رہتی، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق اس بیٹری میں ابھی اتنی جان باقی ہوتی ہے کہ وہ دھکا اسٹارٹ ہو سکتی ہے، اُس وقت کسی مشکل یا کسی مصیبت کی شکل میں دھکا لگایا جاتا ہے تاکہ انسان اگر چاہے تو اس کی مدد سے اپنی اصلاح کرنے کی بیٹری کو اسٹارٹ کر لے۔ کچھ لوگ اس دھکے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کچھ لوگ اس موقع کو بھی ضائع کر دیتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے دھکوں سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اہل ایمان میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ یہاں مجرمین کی بات ہو رہی ہے اس لیے انہیں کی مشکلات اور مصائب کو یہاں دھکا کہا گیا ہے۔ صالحین، صدیقین اور انبیاء کرام کی مشکلات اور مصائب کی حکمتیں اور مصلحتیں کچھ اور ہیں جن کی وضاحت کا یہ موقعہ نہیں ہے۔

اس ڈھیل دینے اور مہلت دینے کی ہدایت میں ان لوگوں کے لیے بڑی اہم رہنمائی ہے جو کسی کی تربیت کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، جیسے والدین، اساتذہ، افسران، وغیرہ۔ اس رہنمائی کے اہم مدارج کو سورۂ تغابن کی آیت۔14۔ میں مزید کھولا گیا ہے۔ وہاں پر قرآن کے الفاظ یہ ہیں۔ وَاِنْ تَعْفُوْا (اور اگر تم لوگ ڈھیل دو) وَتَصْفَحُوْا (اور دیکھی اَن دیکھی کر جاؤ) وَتَغْفِرُوْا (اور معاف کرو) فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ ان دونوں مقامات پر غور کرنے سے ہمیں قرآن مجید کا وہ فارمولا مل جاتا ہے جو انسانوں کو عموماً اور اہل ایمان کو خصوصاً اپنے جونیئرز کی تربیت کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اس فارمولے کی وضاحت ''جینے کا سلیقہ'' حصہ سوم کے صفحہ 74 تا 86 پر کی گئی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں پر اس کا خلاصہ دینا بھی ممکن نہیں ہے۔ البتہ اس میں دی گئی مثال کو ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس سے فارمولا کسی حد تک واضح ہو جائے گا۔

ہم ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے جب ہمیں سینما دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ والد مرحوم سے اجازت مانگی تو نہیں ملی۔ ہم نے والدہ مرحومہ اور دیگر لوگوں سے سفارش کروائی، رونا دھونا بھی کیا، اسکول کا ہوم ورک کرنے کی ہڑتال کی، دو تین وقت کی بھوک ہڑتال بھی کی۔ یہ سب کچھ کرنے کی ہمیں اجازت ملی یعنی ان حرکتوں پر نہ تو ہماری پٹائی ہوئی اور نہ ڈانٹ پڑی لیکن سینما دیکھنے کی اجازت پھر بھی نہیں لی۔

چنانچہ ہم نے چوری چھپے سینما دیکھنے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس میں کچھ قباحتوں سے سابقہ پڑا۔ پہلی قباحت یہ تھی کہ اس طرح شوق پورا کرنا ناممکن تھا کیونکہ ہماری خواہش تھی کہ شہر میں جو بھی پکچر لگے وہ سب دیکھی جائے، لیکن اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ جب کسی پکچر کی بہت تعریف سنتے تھے تب اسے دیکھنے کا پروگرام بناتے تھے۔ شام کو کھیلنے کا جو وقت تھا، اس سے پہلے گھر سے نکلنے کے لیے اور مغرب سے پہلے واپس نہ آنے کے لیے کوئی بہانا گھڑنا پڑتا تھا۔ سینما ہال کے باہر اور اندھر دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی جاننے والا دیکھ نہ لے، وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال اس طرح چوری چھپے پکچر دیکھ کر جب ہم بخیریت گھر واپس آجاتے تھے تو سکھ کا سانس لیتے تھے۔

کچھ عرصہ میں ایک نئی فکر لاحق ہوگئی کہ پتہ نہیں ہماری اس چوری کا والد صاحب کو علم ہے کہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر واپس آکر جو ہم سکھ کا سانس لیتے تھے وہ رخصت ہوا۔ اب رات اس ادھیڑ بن میں گزرتی تھی کہ اگر والا صاحب کو پتہ ہے تو وہ اجازت ہی کیوں نہیں دے دیتے۔ اگر نہیں معلوم اور کبھی معلوم ہو گیا تو پھر کیا ہوگا۔ جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ تو گناہ بے لذت ہے۔ پکچر دیکھ کر گناہ بھی کرتے ہیں اور واپس آکر پریشانی بھی مول لیتے ہیں۔ چنانچہ فیصلہ کرلیا کہ اب پکچر نہیں دیکھیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملازمت کے سلسلہ میں جب دوسرے شہروں میں تنہا رہنے کا موقع ملا، اس وقت تک سینما دیکھنے کا شوق مرجھا چکا تھا۔ احباب کے اصرار پر کبھی کبھار چلے جاتے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔

اس رام کہانی کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ دیکھی اَن دیکھی کر جانے کا اثر ہوتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اتنی جلدی نہ ہو اور اتنا واضح نہ ہو۔ اس لیے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے اور اس ہدایت کو اثر کرنے کا موقع دینا چاہیے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الاعلیٰ (78)

آیت نمبر (1 تا 19)

ترکیب

(آیت۔1) اَلۡاَعۡلَی پر رفع، نصب، جر ظاہر نہیں ہوتی۔ اس لیے گرامر کے لحاظ سے یہ ممکن ہے کہ اس کو حالت نصب میں مانا جائے تو یہ اسم کی صفت ہوگا اور اگر حالت جر میں مانیں تو یہ رَبِّ کی صفت ہوگا۔ لیکن مضمون کے لحاظ سے مناسب یہی ہے کہ اس کو رَبِّ کی صفت مانا جائے۔ (آیت۔2۔3) خَلَقَ۔ سَوّٰی۔ قَدَّرَ۔ ھَدٰی۔ اِن افعال کے مفعول محذوف ہیں۔ اس لیے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی اور یہاں ساری مخلوق مراد ہے، جس میں فرشتے، جن وانس، حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ سب شامل ہو گئے۔ (حافظ احمد یار صاحب)۔ (آیت۔8) یَسَّرَ، باب تفعیل، میں جس چیز کو آسان کرتے ہیں وہ مفعول بنفسہٖ آتا ہے اور جس کے لیے آسان کرتے ہیں اس پر لام کا صلہ آتا ہے۔ یہاں نُیَسِّرُ کا مفعول ضمیر مفعولی کَ ہے۔ ترجمہ اسی لحاظ سے ہوگا۔ یُسۡرٰی صفت ہے۔ اس کا موصوف یہاں محذوف ہے۔ (آیت۔9) ذِکۡرٰی فاعل ہے اور مؤنث ہے اس لیے اس کا فعل نَفَعَتۡ واحد مؤنث ہے۔ (آیت۔11) یَتَجَنَّبُ کی ضمیر مفعولی ھَا۔ اَلذِّکۡرٰی کے لیے ہے۔

ترجمہ

سَبِّحِ	اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ۙ﴿۱﴾	الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ۙ﴿۲﴾	وَالَّذِیۡ
آپ تسبیح کریں	اپنے اعلیٰ رب کے نام کی	وہ، جس نے پیدا کیا پھر اس نے نوک پلک درست کی (اس کی)	اور وہ جس نے

قَدَّرَ	فَهَدٰى ۝٣	وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝٤	فَجَعَلَهٗ	غُثَآءً اَحْوٰى ۝٥
قدر و قیمت اور قدرت طے کی (اس کی)	پھر اس نے راہ سجھائی (اس کو)	وہ جس نے نکالا چارا	پھر اس نے کر دیا اس کو	سیاہ کوڑا

سَنُقْرِئُكَ	فَلَا تَنْسٰٓى ۝٦	اِلَّا مَا	شَآءَ اللّٰهُ ؕ	اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ
ہم پڑھائیں گے آپ کو	تو آپ نہیں بھولیں گے	سوائے اس کے جو	چاہا اللہ نے	بیشک وہ جانتا ہے نمایاں کرنے کو

وَمَا يَخْفٰى ۝٧	وَنُيَسِّرُكَ	لِلْيُسْرٰى ۝٨	فَذَكِّرْ	اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝٩
اور اس کو جو پوشیدہ ہوتا ہے	اور ہم آسان کریں گے (پہنچائیں گے) آپ کو	اُس آسان (طریقت) تک	تو آپ نصیحت کریں	اگر نفع دے یہ بڑی نصیحت

سَيَذَّكَّرُ مَنْ	يَّخْشٰى ۝١٠	وَيَتَجَنَّبُهَا	الْاَشْقَى ۝١١	الَّذِيْ يَصْلَى
نصیحت حاصل کرے گا (اس سے) وہ، جو	ڈرتا ہے	اور اجتناب کرے گا اس سے	بڑا بد بخت	وہ، جو گرے گا

النَّارَ الْكُبْرٰى ۝١٢	ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا	وَلَا يَحْيٰى ؕ ۝١٣	قَدْ اَفْلَحَ مَنْ	تَزَكّٰى ۝١٤
بڑی آگ میں	پھر نہ وہ مرے گا اس میں	اور نہ جیے گا	اس نے مراد پالی ہے جس نے	پاکیزگی حاصل کی

وَذَكَرَ	اسْمَ رَبِّهٖ	فَصَلّٰى ؕ ۝١٥	بَلْ تُؤْثِرُوْنَ	الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝١٦	وَالْاٰخِرَةُ
اور اس نے یاد رکھا	اپنے رب کے نام کو	پھر نماز پڑھی	بلکہ تم لوگ ترجیح دیتے ہو	اس دنیوی زندگی کو	اس حال میں کہ آخرت

خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ ۝١٧	اِنَّ هٰذَا	لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝١٨	صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝١٩
بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے	بیشک یہ (بات)	یقیناً پہلے صحیفوں میں ہے	ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں

نوٹ: 1

لفظ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تمام باتوں سے پاک اور برتر قرار دینا جو اس کی اعلیٰ شان کے منافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور ہی تمام علم و معرفت اور قوت و اعتماد کا سرچشمہ ہے۔ اگر اس میں کوئی خلل پیدا ہو جائے تو انسان صحیح معرفت کی شاہراہ سے ہٹ جاتا ہے۔ اور شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ تسبیح کی سب سے اعلیٰ شکل تو نماز ہے لیکن جس طرح سانس انسان کی مادی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی یاد اس کی روحانی زندگی کے لیے ہر وقت ضروری ہے۔ اس لیے صرف نماز کے اوقات ہی میں نہیں بلکہ زندگی کی دوسری سرگرمیوں کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو آباد رکھنا چاہیے تاکہ شیطان کو اس پر غلبہ پانے کا موقع نہ ملے (تدبر قرآن)

آگے آیات۔ 2 تا 5 میں رَبِّ اَعْلٰی کی صفات کا ذکر ہے جو تخلیق کائنات میں اس کی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ کے مشاہدہ سے متعلق ہیں۔ خلق کے معنی محض صنعت گری کے نہیں بلکہ عدم سے وجود میں لانا بھی ہے۔ دوسری صفت فَسَوّٰی ہے۔ برابر کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز کو جو وجود عطاء فرمایا ہے اس میں اس کی جسامت، شکل وصورت اور اعضاء وغیرہ کی وضع قطع میں ایک خاص تناسب ملحوظ رکھا ہے۔ تیسری چیز سلسلہ میں فرمائی قَدَّرَ، جس کے معنی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور خاص تجویز کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی چیزوں کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا بلکہ ہر چیز کو کسی خاص کام کے لیے پیدا کیا اور اس کے مناسب اس کو وسائل دیئے اور اسی کام میں اس کو لگا دیا۔ غور کیا جائے تو یہ بات کسی خاص جنس یا نوع مخلوق کے لیے مخصوص نہیں۔ ساری کائنات کی مخلوقات ایسی ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے خاص خاص کاموں کے

لیے بنایا ہے اور ہر چیز اپنے رب کی مقرر کردہ ڈیوٹی میں لگی ہوئی ہے۔ چوتھی چیز فرمائی فَهَدٰى ۔یعنی خالق کائنات نے ہر چیز کو جس کام کے لیے پیدا فرمایا اس کو اس کی ہدایت بھی فرمادی کہ وہ کس طرح اس کام کو انجام دے۔ یہ ہدایت تمام کائنات کی مخلوقات کو شامل ہے۔ کیونکہ ایک خاص قسم کی عقل وشعور اللہ تعالیٰ نے ان سب کو دیا ہے، گو وہ انسان کے عقل وشعور سے کم ہو۔

انسان کو حق تعالیٰ نے عقل وشعور سب سے زیادہ عطا فرمایا ہے۔ اور زمین میں پیدا ہونے والی اشیاء انسان کی خدمت اور اس کے نفع کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ مگر ان سے فائدہ اٹھانا مختلف قسم کے منافع حاصل کرنا اور مختلف چیزوں کو جوڑ کر ایک نئی چیز پیدا کر لینا، بڑے علم وہنر کا تقاضہ کرتا ہے۔ قدرت نے انسان کے اندر فطری طور پر عقل وفہم ودیعت کر رکھا ہے۔ اور یہ علم وہنر فلاسفہ کی تحقیقات اور کالجوں کی تعلیمات پر موقوف نہیں، بلکہ دنیا کی ابتدا سے اَن پڑھ جاہل یہ سب کام کرتے ہیں۔ یہی فطری سائنس ہے جو حق تعالیٰ نے انسان کو فطرتاً بخشی ہے۔ پھر فنی اور علمی تحقیقات کے ذریعہ اس میں ترقی کرنے کی استعداد بھی اسی قدرت ربانی کا عطیہ ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ سائنس کسی چیز کو پیدا نہیں کرتی، بلکہ قدرت کی پیدا کردہ اشیاء کا استعمال سکھاتی ہے۔ اس استعمال کا ادنیٰ درجہ تو حق تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً سکھا دیا۔ آگے اس میں فنی تحقیقات اور ترقی کا بڑا وسیع میدان رکھا ہے اور انسان کی فطرت میں اس کو سمجھنے کی استعداد وصلاحیت رکھی ہے جس کے مظاہر اس سائنسی دور میں نت نئے سامنے آرہے ہیں اور معلوم نہیں آگے اس سے زیادہ کیا کیا سامنے آئے گا۔ غور کرو تو یہ سب قرآن کے ایک لفظ فَهَدٰى کی شرح ہے (معارف القرآن)

نوٹ:2

آیت نمبر۔6۔ کے یہ الفاظ کہ ''ہم تمہیں پڑھوا دیں گے پھر تم نہیں بھولو گے'' یہ بتاتے ہیں کہ یہ سورہ اس زمانے میں نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ ﷺ کو ابھی وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق نہیں ہوئی تھی اور نزول وحی کے وقت آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں اس کے الفاظ بھول نہ جائیں۔ اس آیت کے ساتھ سورۂ طٰہٰ کی آیت 114۔ اور سورۂ قیامہ کی آیات۔16 تا19۔ کو ملا کر دیکھا جائے تو واقعات کی ترتیب معلوم ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اس سورہ میں حضورؐ کو اطمینان دلا دیا گیا کہ ہم یہ کلام آپ کو پڑھوا دیں گے اور آپؐ اسے نہ بھولیں گے۔ پھر ایک مدت کے بعد جب سورہ قیامہ نازل ہو رہی تھی تو حضور ﷺ بے اختیار وحی کے الفاظ کو دہرانے لگے۔ اس وقت فرمایا گیا کہ وحی کو جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کو یاد کرا دینا، پڑھوا دینا پھر اس کا مطلب سمجھا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ آخری مرتبہ سورۂ طٰہٰ کے نزول کے موقعہ پر آپؐ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ یہ 113۔ آیتیں جو متواتر نازل ہو رہی ہیں ان میں سے کچھ میرے حافظے سے نکل نہ جائے اور آپؐ ان کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگے اس پر فرمایا گیا کہ قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کریں جب تک آپؐ کی طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ اس کے بعد پھر کبھی اس کی نوبت نہیں آئی۔ (تفہیم القرآن۔ ج6۔ص۔308)

آگے فرمایا گیا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ۔ اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پورے قرآن کا لفظ بلفظ آپؐ کے حافظے میں محفوظ ہو جانا آپؐ کی اپنی قوت کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی توفیق کا نتیجہ ہے، ورنہ اللہ چاہے تو اسے بھلا سکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی وقتی طور پر آپؐ کو نسیان لاحق ہو جانا اور آپؐ کا کسی آیت یا لفظ کو کسی وقت بھول جانا اس وعدے سے مستثنیٰ ہے۔ وعدہ جس بات کا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپؐ مستقل طور پر قرآن کے کسی لفظ کو نہیں بھول جائیں گے۔ اس مفہوم کی تائید بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے رسول اللہؐ قرأت کے دوران میں ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد حضرت اُبی بن کعبؓ نے پوچھا کہ کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ آپؐ نے فرمایا نہیں میں بھول گیا تھا۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

آیت۔8۔کالفظی ترجمہ یہ ہے کہ ہم آپؐ کوطریقہ یُسْرٰی کے لیے آسان کردیں گے۔اس مقام کا تقاضہ یہ تھا کہ فرمایا جاتا ہے کہ ہم اس طریقہ اور شریعت کو آپؐ کے لیے آسان کردیں گے لیکن قرآن کریم نے اس کو چھوڑ کر یہ فرمایا کہ ہم آپؐ کو اس طریقہ کے لیے آسان کردیں گے۔اس میں یہ بتادینا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو طبعی طور پر اور مادی طور پر ایسا بنادیں گے کہ شریعت آپ کی طبعیت بن جائے اور آپؐ شریعت کے سانچے میں ڈھل جائیں۔(معارف القرآن)

عام طور پر مفسرین نے ان دو فقروں (آیات۔8۔9) کو الگ الگ سمجھا ہے۔لیکن ہمارے نزدیک فَذَكِّرْ کا لفظ دونوں فقروں کو باہم مربوط کرتا ہے۔اور بعد کے فقروں کا مضمون پہلے فقرے کے مضمون پر مرتب ہوتا ہے۔اس لیے ہم اس ارشاد الٰہی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اے نبیؐ ہم تبلیغ دین کے معاملہ میں آپؐ کو کسی مشکل میں ڈالنا چاہتے کہ تم بہروں کو سناؤ اور اندھوں کو راہ دکھاؤ بلکہ ایک آسان طریقہ تمہارے لیے میسر کیے دیتے ہیں اور وہ یہ نصیحت کرو جہاں تمہیں یہ محسوس ہو کہ کوئی اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے۔اب رہی یہ بات کہ کون فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے،تو ظاہر ہے کہ اس کا پتہ تبلیغ عام ہی سے چل سکتا ہے۔اس لیے عام تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے مگر اس سے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ ان لوگوں کو تلاش کرو جو اس سے فائدہ اٹھا کر راہ راست اختیار کرنا چاہیں۔انہی کی تعلیم و تربیت پر توجہ صرف کرنا چاہیے۔

نوٹ:4

آیت۔13۔کا مطلب ہے کہ نہ اسے موت ہی آئے گی کہ عذاب سے چھوٹ جائے اور نہ جینے کی طرح جیئے گا کہ زندگی کا کوئی لطف اسے حاصل ہو۔یہ سزا ان لوگوں کے لیے ہے جو سرے سے اللہ اور اس کے رسول کی نصیحت کو قبول نہ کریں اور مرتے دم تک کفر و شرک یا دہریت پر قائم رہیں۔رہے وہ لوگ جو دل میں ایمان رکھتے ہوں مگر اپنے برے اعمال کی بنا پر جہنم میں ڈالے جائیں تو ان کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ جب وہ اپنی سزا بھگت لیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں موت دے گا۔پھر ان کے حق میں شفاعت قبول کی جائے گی اور ان کی جلی ہوئی لاشیں جنت کی نہروں پر لا کر ڈالی جائیں گی اور اہل جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی ڈالو اس پانی سے وہ اس طرح جی اٹھیں گے جیسے نباتات پانی پڑنے سے اُگ آتی ہیں۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:5

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے دوسرے متعدد نبیوں کے صحیفے اسفارِ تورات کی شکل میں موجود ہیں۔ان میں اگرچہ بہت سی تحریفیں ہو چکی ہیں اور ان کی حیثیت تاریخ کی کتابوں سے زیادہ نہیں ہے،تاہم ان سب میں توحید اور قیامت کی تعلیم نہایت واضح اور مؤثر الفاظ میں اتنی کثرت سے موجود ہے کہ جس صحیفے کو بھی پڑھیے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو جو تعلیم دی تھی،اگرچہ وہ صحیفے کی شکل میں نہیں تھی بلکہ زبانی تعلیم و تلقین کی صورت میں تھی۔ان کی ذریت کی ایک شاخ یعنی بنی اسرائیل نے اس کو اپنے صحیفوں میں بشکل تحریر محفوظ کیا اور ان کے انبیاؑ اپنے اپنے دور میں برابر اس کی یاددہانی کرتے رہے،جس کی ناقابل تردید شہادت آج بھی ان کے صحیفوں میں موجود ہے۔اور قرآن نے بھی جابجا اس کا حوالہ دیا ہے۔آپؑ کی ذریت کی دوسری شاخ بنی۔اسمٰعیل نے اس کو تحریری شکل میں محفوظ نہیں کیا۔انہوں نے روایات کی صورت میں اس کو کچھ مدت تک باقی رکھا پھر اس پر رفتہ رفتہ ذہول کا پردہ پڑ گیا۔پھر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے اس کی تجدید اور تکمیل ہوئی۔(تدبر قرآن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ 2004

سورۃ الغاشیۃ (88)

آیت نمبر (1 تا 16)

ترکیب

(آیت۔2۔3) وُجُوۡہٌ حالانکہ نکرہ ہے لیکن یہاں یہ مبتدا ہے۔ مفہوم کی ادائیگی کے تقاضے کے تحت اس کو معرفہ کے بجائے نکرہ لایا گیا ہے۔ خَاشِعَةٌ کی خبر ہے۔ آگے عَامِلَةٌ اور نَاصِبَةٌ کو بھی اگر اس کی خبر مانیں تو مفہوم بنتا ہے کہ کچھ چہرے اس دن عاجزی کرنے والے ہیں، عمل کرنے والے ہیں، محنت کرنے والے ہیں یہ مفہوم خلاف واقعہ ہے۔ اور اگر عَامِلَةٌ اور نَاصِبَةٌ کو وُجُوۡہٌ کی صفت مانیں تو پھر مفہوم بنتا ہے کہ کچھ عمل کرنے والے محنت کرنے والے چہرے اس دن عاجزی کرنے والے ہیں۔ اور یہی مفہوم حضرت عمرؓ سے منقول ہے۔ (دیکھیں معارف القرآن)۔ (آیت۔4۔5) تَصۡلٰی اور تُسۡقٰی واحد مؤنث کے صیغے ہیں۔ وَجُوۡہٌ جمع مکسر ہے، اس لیے لفظی رعایت کے تحت واحد مؤنث صیغے آئے ہیں۔ تُسۡقٰی، ثلاثی مجرد اور باب افعال، دونوں کا مجہول ہوسکتا ہے کیونکہ دونوں کے مضارع مجہول ہم شکل ہوجاتے ہیں۔ اگر ثلاثی مجرد سے مانیں تو مطلب ہوگا، ان کو پلایا جائے گا۔ اگر باب افعال سے مانیں تو مطلب ہوگا انہیں پینے کو دیا جائے گا۔ (آیت۔6) وُجُوۡہٌ کی لفظی رعایت کے تحت لَیۡسَ لَھَا آنا چاہیے تھا لیکن یہاں معنوی رعایت کی گئی ہے اس لیے لَھُمۡ آیا ہے۔ (آیت۔11) لَاغِیَةً اسم الفاعل کے وزن پر صفت ہے۔ اس کا موصوف محذوف ہے جو کَلِمَةً ہوسکتا ہے۔ (آیت۔12 تا 16) اِن آیات میں عَیۡنٌ جَارِیَةٌ۔ سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَةٌ۔ اَکۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَةٌ۔ نَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَةٌ۔ زَرَابِیُّ مَبۡثُوۡثَةٌ۔ یہ سب مبتدا مؤخر نکرہ ہیں اور ان کی خبریں محذوف ہیں۔ آیت۔12۔13۔ میں متعلق خبر فِیۡھَا آیا ہے۔ آگے اس کو محذوف کردیا گیا ہے۔

ترجمہ

هَلۡ اَتٰىكَ	حَدِیۡثُ الۡغَاشِیَةِ ۘ﴿۱﴾	وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ	خَاشِعَةٌ ۙ﴿۲﴾
کیا پہنچی آپؐ کے پاس	اُس چھا جانے والی (قیامت) کی بات	کچھ چہرے (کچھ لوگ) اُس دن	عاجزی کرنے والے ہیں

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۙ﴿۳﴾	تَصۡلٰی نَارًا حَامِیَةً ۙ﴿۴﴾	تُسۡقٰی	مِنۡ عَیۡنٍ اٰنِیَةٍ ؕ﴿۵﴾
جو عمل کرنے والے محنت کرنے والے تھے	وہ گریں گے ایک دہکنے والی آگ میں	انھیں پینے کو دیا جائے گا	ایک انتہائی (گرم) چشمے سے

لَیۡسَ لَهُمۡ طَعَامٌ	اِلَّا مِنۡ ضَرِیۡعٍ ۙ﴿۶﴾	لَّا یُسۡمِنُ	وَلَا یُغۡنِیۡ	مِنۡ جُوۡعٍ ؕ﴿۷﴾
نہیں ہوگا ان کے لیے کوئی کھانا	مگر ایک خاردار درخت سے	وہ موٹا نہیں کرے گا	اور نہ وہ بے نیاز کرے گا	بھوک سے

وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ	نَّاعِمَةٌ ۙ﴿۸﴾	لِّسَعۡیِهَا	رَاضِیَةٌ ۙ﴿۹﴾
کچھ چہرے (لوگ) اُس دن	تروتازہ ہونے والے ہیں	اپنی کوشش (کے نتیجے) سے	راضی ہونے والے ہیں

فِیۡ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ۙ﴿۱۰﴾	لَّا تَسۡمَعُ فِیۡهَا	لَاغِیَةً ؕ﴿۱۱﴾	فِیۡهَا عَیۡنٌ جَارِیَةٌ ؕ﴿۱۲﴾
(وہ لوگ ہوں گے) ایک اعلیٰ باغ میں	وہ نہیں سنیں گے اس میں	کوئی لایعنی (بات)	اس میں جاری ہونے والے چشمے میں

فِیۡهَا سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَةٌ ۙ﴿۱۳﴾	وَّاَکۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَةٌ ۙ﴿۱۴﴾	وَّنَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَةٌ ۙ﴿۱۵﴾	وَّزَرَابِیُّ مَبۡثُوۡثَةٌ ؕ﴿۱۶﴾
اس میں بلند کیے ہوئے تخت ہیں	اور چنے ہوئے جام ہیں	اور قطار بنائے ہوئے قالین ہیں	اور بکھیرے ہوئے گاؤ تکیے ہیں

نوٹ:1

پہلی آیت میں سوال ہے کیا آپ ﷺ کو پہنچی۔اس انداز میں جو سوال ہوتا ہے وہ جواب طلب کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ کسی چیز کی ہیبت یا اس کی عظمت کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔آگے وُجُوْہٌ سے مراد اگرچہ افراد ہیں لیکن ان کو تعبیر وُجُوْہٌ سے اس لیے کیا ہے کہ ان کی اندرونی کیفیات کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔اور کیفیات کا اظہار سب سے زیادہ نمایاں طریقہ پر چہروں ہی سے ہوتا ہے۔(تدبر قرآن)

نوٹ:2

آیت۔2۔3 میں کافروں کے چہرے کا ایک حال یہ بتایا ہے کہ وہ خاشعہ ہوں گے۔خشوع کے معنے جھکنے اور ذلیل ہونے کے ہیں۔نماز میں خشوع کا یہی مطلب ہے کہ اللہ کے سامنے جھکنے اور ذلت وپستی کے آثار اپنے وجود پر طاری کرے۔جن لوگوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع اختیار نہیں کیا،ان کو اس کی سزا قیامت میں یہ ملے گی کہ وہاں ان کے چہروں پر ذلت اور رسوائی چھائی ہوئی ہوگی۔ان کے چہروں کا دوسرا اور تیسرا حال یہ بیان فرمایا کہ عاملہ اور ناصبہ ہوں گے کفار ومجرمین کا یہ حال کہ وہ عمل اور محنت سے تھکے اور درماندہ ہوں گے،ظاہر ہے کہ ان کی دنیا کا ہے۔کیونکہ آخرت میں کوئی اور محنت نہیں ہے۔اسی لیے قرطبی وغیرہ مفسرین نے اس کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ خاشعہ کا حال تو آخرت میں ہوگا،جبکہ عاملہ اور ناصبہ کے دونوں حال ان لوگوں کے دنیا ہی میں ہوتے ہیں۔بہت سے کفار اور فجار مشرکانہ عبادت اور باطل طریقوں سے مجاہدہ اور ریاضت دنیا میں کرتے رہتے ہیں۔ہندوؤں کے جوگی اور نصاریٰ کے راہب وغیرہ کے علاوہ بہت سے ایسے بھی ہیں جو اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی کی رضا جوئی کے لیے دنیا میں عبادت وریاضت کرتے ہیں اور اس میں محنت شاقہ برداشت کرتے ہیں مگر وہ عبادات مشرکانہ اور باطل طریقہ پر ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی اجر وثواب نہیں رکھتی۔(عبدالدینار اور عبدالدرہم قسم کے لوگ بھی عبادت میں نہیں بلکہ دنیا میں اپنی روزی کمانے کے لیے اللہ پر توکل اور قناعت کرنے والوں سے کئی گنا زیادہ محنت ومشقت کرتے ہیں،چاہے نماز پڑھتے ہوں،چاہے روزے رکھتے ہوں۔اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ ان کے نماز روزے انھیں خاشعہ سے بچالیں گے،لیکن عاملہ ناصبہ کی سزا تو نقد ہے۔یہ لوگ دنیا تو خوب کماتے ہیں لیکن دنیا کے حقیقی لطف وسرور سے بلعموم محروم چلے جاتے ہیں۔اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ۔مرتب)۔

حضرت حسن بصریؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ جب ملک شام میں تشریف لے گئے تو ایک نصرانی راہب ان کے پاس آیا جو اپنے مذہب کی عبادت وریاضت میں لگا ہوا تھا۔محنت سے اس کا چہرہ بگڑا ہوا،بدن خشک اور لباس خستہ تھا۔جب حضرت عمرؓ نے اس کو دیکھا تو آپ رو پڑے۔لوگوں نے سبب پوچھا تو آپؓ نے فرمایا کہ مجھے اس کے حال پر رحم آگیا کہ اس بیچارے نے رضائے الٰہی کے لیے بڑی محنت کی مگر وہ اس کو نہیں پاسکا۔اور حضرت عمرؓ نے یہی آیات۔2۔3۔تلاوت فرمائیں۔(معارف القرآن)

نوٹ:3

قرآن مجید میں کہیں فرمایا گیا ہے کہ جہنم کے لوگوں کو زقوم کھانے کے لیے دیا جائے گا۔کہیں ارشاد ہوا ہے کہ ان کے لیے غسلین کے سوا کوئی کھانا نہیں ہوگا۔اور یہاں فرمایا جارہا ہے کہ انھیں خاردار سوکھی گھاس کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ان بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ان کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جہنم کے بہت سے درجے ہوں گے جن میں مختلف قسم کے مجرمین اپنے جرائم کے لحاظ سے ڈالے جائیں گے اور مختلف قسم کے عذاب ان کو دیئے جائیں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ زقوم کھانے سے بچنا چاہیں گے تو غسلین ان کو ملے گا اس سے بھی بچنا چاہیں گے تو خاردار گھاس کے سوا کچھ نہ پائیں گے۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:4

اہل دوزخ کے متعلق قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ دوزخ کے باڑے میں پہنچتے ہی وہ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے کہ فلاں نے ہم کو گمراہ کیا۔وہ گمراہ نہ کرتا تو ہم ہدایت پر ہوتے۔لیڈروں اور ان کی پیروی کرنے والوں میں تو تکار ہوگی۔اپنے اپنے پیروں اور لیڈروں کے لیے وہ لوگ دونے عذاب کا مطالبہ کریں گے۔لیڈر جواب دیں گے کہ تم نے خود اپنی شامت بلائی کہ جان بوجھ کر ہماری پیروی

کی۔اس کے برعکس اہل جنت کا یہ حال بیان ہوا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہونے کے بعد ایک فتح مند ٹیم کی طرح ایک دوسرے کا خیر مقدم تحیت و سلام سے کریں گے۔ آپس میں مبارکہ سلامت کے تبادلے ہوں گے۔ نہایت خوشگوار موڈ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے اور ان کی مجلس محبت واخلاص کی عطر بیزیوں سے معمور ہوگی۔ (تدبر قرآن)

آیت نمبر (17 تا 26)

س ط ح

(ف) سَطَحًا بچھانا۔ ہموار کرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔20۔

ترکیب

(آیات۔17۔تا20) میں تمام افعال واحد مونث آئے ہیں۔اس کی وجہ سمجھ لیں۔اَلْاِبِلِ اسم جنس ہے جس میں تمام اونٹ اور اونٹنیاں شامل ہیں۔اس طرح یہ اسم جمع کے حکم میں ہے جس کے لیے فعل واحد مذکر یا واحد مونث، دونوں میں سے کسی طرح لانا جائز ہوتا ہے۔(دیکھیں آسان عربی گرامر، حصہ دوم، پیراگراف: ۳۱:۴) اَلسَّمَآءِ اور اَلْاَرْضِ، دونوں مؤنث سماعی ہیں، جبکہ اَلْجِبَالِ غیر عاقل کی جمع مکسر ہے اَلسَّمَآءِ اور اَلْجِبَالِ پر لام جنس ہے جبکہ اَلْاَرْضِ پر لام تعریف ہے۔(آیت۔23) اِلَّا سے استثناء کا تعلق سابقہ آیت میں مُصَیْطِرٍ سے نہیں ہے بلکہ اس سے بھی پہلے کی آیت میں فَذَكِّرْ سے ہے۔مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ نصیحت کرتے رہیں سوائے اس کے جو منہ موڑے اور انکار کرے، کیونکہ آپ نصیحت کرنے والے ہیں، داروغہ نہیں ہیں۔

ترجمہ

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ	كَيْفَ خُلِقَتْ ⑰	وَاِلَى السَّمَآءِ	كَيْفَ رُفِعَتْ ⑱
تو کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں اونٹوں کی طرف	(کہ) کیسا اس کو بنایا گیا	اور آسمانوں کی طرف	(کہ) کیسا ان کو بلند کیا گیا

وَاِلَى الْجِبَالِ	كَيْفَ نُصِبَتْ ⑲	وَاِلَى الْاَرْضِ	كَيْفَ سُطِحَتْ ⑳
اور پہاڑوں کی طرف	(کہ) کیسا ان کو گاڑا گیا	اور اس زمین کی طرف	(کہ) کیسا اس کو بچھایا گیا

فَذَكِّرْ	اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ㉑	لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ㉒
تو آپؐ نصیحت کرتے رہیں	آپؐ تو بس نصیحت کرنے والے ہیں	اُن پر کوئی داروغہ نہیں ہیں

اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ㉓	فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ
(اس لیے نصیحت کرتے ہیں) سوائے اس کے جس نے منہ موڑا اور (سننے سے ہی) انکار کیا	تو ان کو عذاب دے گا اللہ

الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ㉔	اِنَّ اِلَيْنَآ	اِيَابَهُمْ ㉕	ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا	حِسَابَهُمْ ㉖
وہ بڑا (دوزخ کا) عذاب	یقیناً ہماری طرف ہی	ان کی واپسی ہے	پھر یقیناً ہم پر ہی ہے	ان سے حساب لینا

نوٹ:1

آیات۔17 تا20 کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ آخرت کی باتیں سن کر کہتے ہیں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوسکتا ہے تو کیا اپنے گردوپیش کی دنیا پر نظر ڈال کر انہوں نے کبھی نہ سوچا کہ یہ اونٹ کیسے بن گئے۔آسمان کیسے بلند ہوگیا۔ پہاڑ کیسے قائم ہوگئے، زمین کیسے بچھ گئی۔ یہ ساری چیزیں اگر بن سکتی ہیں اور بنی بنائی ان کے سامنے موجود ہیں تو آخرت میں ایک دوسری دنیا کیوں نہیں بن سکتی۔ جنت اور دوزخ کیوں نہیں ہو سکتیں۔(تفہیم القرآن)

کائنات کی بے شمار چیزوں میں سے ان چار چیزوں کی تخصیص بقول ابن کثیرؒ اس لیے ہے کہ عرب کے لوگ اکثر جنگلوں میں چلتے پھرتے تھے۔اس وقت ان کے سامنے یہی چار چیزیں ہوتی تھیں۔سواری میں اونٹ، اوپر آسمان، نیچے زمین اور اردگرد پہاڑ۔اس لیے ان ہی علامات میں غور کرنے کے لیے ارشاد ہوا۔(ترجمہ شیخ الہندؒ)

ان میں سے دو نشانیاں، اونٹ اور زمین، ربوبیت کے پہلو سے اور دو نشانیاں، آسمان اور پہاڑ، خالق کی قدرت وحکمت کے پہلو سے زیادہ نمایاں ہیں۔خالق کی انہی صفات پر قیامت اور جزاء وسزا کے پورے پہلو کی بنیاد ہے۔(تدبر قرآن)

نوٹ:2

جانوروں میں اونٹ کی کچھ ایسی خصوصیات بھی ہیں جو غور کرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت وقدرت کا آئینہ بن سکتی ہیں۔اول تو عرب میں ڈیل ڈول کے اعتبار سے سب سے بڑا جانور اونٹ ہی ہے، ہاتھی وہاں ہوتا نہیں۔دوسرے اللہ تعالیٰ نے اس عظیم جانور کو ایسا بنا دیا کہ عرب کے بدو اور مفلس آدمی بھی اتنے بڑے جانور کو پالنے اور رکھنے میں کوئی مشکل محسوس نہ کریں، کیونکہ اس کو چھوڑ دیں تو یہ اپنا پیٹ خود بھر لیتا ہے۔ اونچے درختوں کے پتے توڑنے کی زحمت بھی آپ کو نہیں کرنا پڑتی یہ خود درختوں کی شاخیں کھا کر گزارہ کر لیتا ہے۔اس کی خوراک ہاتھی اور دوسرے جانوروں کی طرح نہیں جو بہت مہنگی پڑتی ہے۔عرب میں پانی ایک بہت کمیاب چیز ہے، ہر جگہ ہر وقت نہیں ملتا۔قدرت نے اس کے پیٹ میں ایک ریزروٹنکی ایسی لگا دی ہے کہ سات آٹھ روز کا پانی وہ اس ٹنکی میں محفوظ کر لیتا ہے اور تدریجی رفتار سے وہ اپنی پانی کی ضرورت کو پورا کرتا رہتا ہے۔اتنے اونچے جانور پر سوار ہونے کے لیے سیڑھی لگانی پڑتی مگر قدرت نے اس کے پاؤں کو تین تہہ میں تقسیم کر دیا یعنی ہر پاؤں میں دو گھٹنے بنا دیئے، جسے وہ طے کر کے بیٹھ جاتا ہے تو اس پر چڑھنا اور اترنا آسان ہو جاتا ہے۔محنت کش اتنا کہ سب جانوروں سے زیادہ بوجھ اٹھا لیتا ہے۔عرب کے میدانوں میں دھوپ کی وجہ سے دن کا سفر سخت مشکل ہے۔قدرت نے اس کو رات بھر چلنے کا عادی بنا دیا۔مسکین طبع ایسا ہے کہ ایک بچی اس کی مہار پکڑ کر جہاں چاہے لے جائے۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات میں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت بالغہ کا سبق دیتی ہیں۔(معارف القرآن)

یہ واحد جانور ہے کہ اس کو بیٹھا کر اس کی پیٹھ پر بوجھ لادیں، پھر اس کو کھڑا کریں تو یہ بوجھ سمیت اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔کسی دوسرے جانور میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ پیٹھ پر بوجھ لاد کر بیٹھے سے اٹھ کھڑا ہو۔کہتے ہیں کہ کسی شخص نے اپنی ایک دانا بزرگ کو بتایا کہ میں نے ایک ایسا جانور دیکھا ہے جو بوجھ لاد کر اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے۔تو بزرگ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو اس کی گردن ضرور لمبی ہوگی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اونٹ کی گردن بوجھ اٹھانے کے لیے لیور کا کام دیتی ہے۔(حافظ احمد یار صاحب)

نوٹ:3

اب آیت۔21۔اور اس سے آگے نبی ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ آپ ﷺ کے انذار کو جھٹلا رہے ہیں وہ اس وجہ سے نہیں جھٹلا رہے ہیں کہ اس انذار کے حق میں دلائل نہیں ہیں۔دلائل تو آسمان سے لے کر زمین تک چپہ چپہ پر ہیں لیکن ان سے فائدہ ہی اٹھاتے ہیں کہ جن کے اندر خشیت ہوتی ہے۔رہے وہ لوگ جن کے دلوں پر قساوت چھا چکی ہے وہ ان نشانیوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔اس لیے آپ ﷺ ان کے رد وقبول سے بے نیاز ہو کر اپنی تذکیر و تبلیغ ہی ہے۔آپ ﷺ پر یہ ذمہ داری نہیں ہے آپ ان کے دلوں میں ایمان اتار ہی دیں۔ اللہ نے آپ کو یاددہانی کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، ان کے ایمان نہ لانے کی پرسش آپ ﷺ سے ہو(تدبر قرآن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

2004

سورۃ الفجر (89)

آیت نمبر (1 تا 14)

ترکیب

(آیت۔2) لَیَالٍ دراصل لَیَالِیٌ ہے جو قاعدہ کے مطابق تبدیل ہو کر لَیَالٍ لکھی جاتی ہے۔ (آیت۔4) یَسۡرِ مادہ ''ی س ر'' سے نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ اس کا ماضی ہوتا تو یَسَرَ یا یَسُرَ ہوتا یَیۡسِرُ یا یَیۡسُرُ ہوتا، کیونکہ یہ باب ضَرَبَ اور کَرُمَ دونوں سے آتا ہے۔ یہاں یَسۡرِ میں سین پر علامت سکون اور را کی کسرہ بتا رہی ہے کہ یہ مادہ ''س ری'' کا مضارع یَسۡرِیۡ ہے، جس کی یا گری ہوئی ہے۔ (آیت۔7) قبیلہ عاد دو تھے۔ عادِ اولیٰ کا دوسرا نام اِرَمُ (غیر منصرف) ہے۔ یہاں یہ عَادٍ کے بدل کے طور پر آیا ہے اس لیے اِرَمَ حالت جَر میں ہے۔ذَاتِ الۡعِمَادِ اِرَمَ کی صفت ہے اس لیے ذَاتِ حالت جر میں آیا ہے۔اور عَادٍ ایک قبیلہ ہے اس لیے ذَاتِ مؤنث کا صیغہ آیا۔ (آیت۔8) لَمۡ یُخۡلَقۡ کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے مِثۡلُهَا میں مِثۡلُ حالت رفع میں آیا ہے۔ (آیات۔9۔10) ثَمُوۡدَ اور فِرۡعَوۡنَ، یہ دونوں لِعَادٍ کی بِ پر عطف ہونے کی وجہ سے حالت جَرّ میں ہیں۔ (آیت۔11) اَلَّذِیۡنَ جمع کا صیغہ بتا رہا ہے کہ یہ عاد، ثمود اور فرعون تینوں کے لیے ہے۔

ترجمہ

وَالۡفَجۡرِ ۙ﴿۱﴾	وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ﴿۲﴾	وَّالشَّفۡعِ	وَالۡوَتۡرِ ۙ﴿۳﴾	وَالَّیۡلِ	اِذَا یَسۡرِ ۚ﴿۴﴾
قسم ہے فجر کی	اور قسم ہے دس راتوں کی	اور قسم ہے جفت کی	اور قسم ہے طاق کی	اور قسم ہے رات کی	جب وہ چلتی (ڈھلتی) ہے

هَلۡ فِیۡ ذٰلِكَ قَسَمٌ	لِّذِیۡ حِجۡرٍ ؕ﴿۵﴾	اَلَمۡ تَرَ	كَیۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ	بِعَادٍ ۙ﴿۶﴾
کیا اس میں کوئی قسم ہے	کسی عقل والے کیلیے	کیا آپؐ نے دیکھا نہیں	(کہ) کیسا کیا آپؐ کے رب نے	عاد کے ساتھ

اِرَمَ	ذَاتِ الۡعِمَادِ ۙ﴿۷﴾	الَّتِیۡ لَمۡ یُخۡلَقۡ	مِثۡلُهَا	فِی الۡبِلَادِ ۙ﴿۸﴾
(یعنی عادِ) ارم کے ساتھ	جو ستونوں والے تھے	وہ، پیدا نہیں کیا گیا	جن کے جیسا	سارے شہروں میں

وَثَمُوۡدَ	الَّذِیۡنَ جَابُوا الصَّخۡرَ	بِالۡوَادِ ۙ﴿۹﴾	وَفِرۡعَوۡنَ	ذِی الۡاَوۡتَادِ ۙ﴿۱۰﴾
اور ثمود کے ساتھ	جنہوں نے تراشیں چٹانیں	اس وادی میں	اور فرعون کے ساتھ	جو میخوں والا تھا

الَّذِیۡنَ طَغَوۡا	فِی الۡبِلَادِ ۙ﴿۱۱﴾	فَاَكۡثَرُوۡا فِیۡهَا	الۡفَسَادَ ۙ﴿۱۲﴾	فَصَبَّ عَلَیۡهِمۡ
وہ لوگ جنہوں نے سرکشی کی	شہروں میں	پھر انہوں نے کثرت دی اُن میں	فساد کو	تو برسایا ان پر

رَبُّكَ سَوۡطَ عَذَابٍ ؕ﴿۱۳﴾	اِنَّ رَبَّكَ	لَبِالۡمِرۡصَادِ ؕ﴿۱۴﴾
آپؐ کے رب نے ایک عذاب کا کوڑا	بیشک آپؐ کا رب	یقیناً گھات میں ہے

نوٹ: 1

یہاں پانچ چیزوں کی قسم کھا کر اس مضمون کی تاکید کی گئی ہے جو آگے اِنَّ رَبَّكَ لَبِالۡمِرۡصَادِ میں بیان ہوا ہے، یعنی اس دنیا میں تم جو کچھ کر رہے ہو اس پر جزاء و سزا ہونا لازمی اور یقینی ہے۔ تمہارا رب تمہارے سب اعمال کی نگرانی میں ہے۔

وہ پانچ چیزیں جن کی قسم کھائی ہے، ان میں پہلی چیز فجر یعنی صبح صادق ہے۔ ہوسکتا ہے اس سے مراد ہر روز کی صبح ہو، کیوں کہ وہ عالم میں ایک انقلاب عظیم لاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ حضرت علیؓ، ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ سے یہی معنی منقول ہے۔ بعض مفسرین نے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ یعنی یوم النحر (خون بہانے کا دن) کی صبح کو اس کی مراد قرار دیا ہے۔ مجاہدؒ و عکرمہؒ کا یہی قول ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایک روایت میں یہ قول منقول ہے۔ اس یوم النحر کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دن کے ساتھ ایک رات لگائی ہے جو اسلامی اصول کے مطابق دن سے پہلے ہوتی ہے۔ صرف یوم النحر ایک ایسا دن ہے کہ اس کے ساتھ کوئی رات نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یوم النحر سے پہلے جو رات ہے وہ یوم النحر کی نہیں بلکہ شرعاً یوم العرفہ ہی کی رات قرار دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حج کرنے والا عرفہ کے دن میدان عرفات میں نہ پہنچ سکا لیکن رات کو صبح صادق سے پہلے کسی وقت بھی عرفات میں پہنچ گیا تو اس کا وقوف معتبر اور حج صحیح ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ روز عرفہ کی دو راتیں ہیں اور یوم النحر کی کوئی رات نہیں۔ اس طرح یوم النحر کی صبح ایک خاص شان رکھتی ہے۔

دوسری قسم دس راتوں کی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ، مجاہدؒ، سُدیؒ، ضحاکؒ، کلبیؒ، ائمہ تفسیر کے نزدیک ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں اس سے مراد ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ان کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ دس راتیں وہ ہی ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے قصے میں آئی ہیں۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ کے لیے بھی یہی دس راتیں ذی الحجہ کی مقرر کی گئی تھیں۔

وَالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ ۔ قران کریم کے الفاظ سے یہ متعین نہیں کہ اس جفت اور طاق سے کیا مراد ہے۔ اس لیے اس میں ائمہ تفسیر کے بے شمار اقوال ہیں۔ ایک مرفوع حدیث میں جسے ابوزبیر نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے، یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وَالۡفَجۡرِ وَلَيَالٍ عَشۡرٍ کے متعلق فرمایا کہ فجر سے مراد صبح اور عشر سے مراد عشرۂ نحر ہے۔ اور فرمایا کہ وتر سے مراد روز عرفہ اور شفع سے مراد یوم النحر ہے۔ قرطبیؒ نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ یہ اسناد کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے بہ نسبت دوسری حدیث کے جس میں شفع اور وتر نماز کا ذکر ہے۔ اسی لیے حضرت ابن عباسؓ، عکرمہؒ، نحاسؒ نے اسی کو اختیار کیا کہ شفع سے مراد یوم النحر اور وتر سے مراد یوم عرفہ ہے۔

وَالَّيۡلِ اِذَا يَسۡرِ ۔ يَسۡرِیۡ کی معنے رات کو چلنے کے ہیں۔ یہاں خود رات کو کہا گیا کہ جب وہ چلنے لگے یعنی ختم ہونے لگے۔ یہ پانچ قسمیں ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی دعوت دینے کے لیے فرمایا کہ کیا عقل والے آدمی کے لیے یہ قسمیں کافی ہیں یا نہیں۔ (معارف القرآن ج 8۔ ص 738 تا 740 سے ماخوذ)

نوٹ: 2

یہاں جو قسمیں کھائی گئی ہیں وہ دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں کہ اس کائنات کا مدبر حقیقی اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اسی کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ہے۔ وہی جب چاہتا ہے ایک چیز کو نمودار کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کو اوجھل کر دیتا ہے۔ وہ جس کو جس حد تک چاہتا ہے ڈھیل دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے روک دیتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اپنی مقرر کردہ حد سے آگے بڑھے یا اس کے اختیار میں مداخلت کر سکے (تدبر قرآن۔ ج 9۔ ص 346)

ان اضداد سے پہلی دلیل تو قرآن نے توحید پر قائم کی ہے۔ (جیسا کہ اوپر وضاحت کی گئی)۔ اور قرآن نے اس سے دوسری دلیل قیامت پر قائم فرمائی ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں یوں ہے کہ اس دنیا میں اس کے خالق نے ہر چیز جوڑے جوڑے پیدا کی ہے۔ اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنی غایت کو پہنچتی ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی حکم اس دنیا پر بھی لگ سکتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ آخرت کو نہ ملایئے تو اس کے اندر ایک ایسا خلا رہ جاتا ہے جو آخرت کو مانے بغیر کسی طرح نہیں بھرتا۔ اس میں نیکی اور بدی، عدل اور ظلم میں ہر وقت جو کشمکش برپا ہے اس

کا فطری مطالبہ یہ ہے کہ ایک ایسا روز انصاف آئے جس میں اس کا خالق لوگوں کا محاسبہ کرے۔ پھر اچھے بندوں کو صلہ دے اور بروں کو ان کے کیفرِ کردار کو پہنچا دے۔ تیسری حقیقت یہ واضح فرمائی ہے کہ جس طرح انسان کے مادی وجود کے لیے دن کی روشنی اور حرارت کے ساتھ رات کی تاریکی اور خنکی بھی ضروری ہے، اسی طرح اس کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو تنگی اور فراخی، صحت اور مرض کی آزمائشوں سے گزارا جائے، تاکہ اس کے صبر اور شکر کی تربیت ہو اور وہ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کا مقام حاصل کرنے کا اہل بنے۔ چوتھی حقیقت یہ واضح فرمائی کہ کسی کو، خواہ وہ کتنا ہی زور اور اثر رکھنے والا ہو، خدا کی ڈھیل سے اس گھمنڈ میں نہیں پڑنا چاہیے کہ وہ اس کی گرفت سے باہر ہے۔ جب سورج اور چاند، رات اور دن اس کے کنٹرول سے باہر نہیں تو انسان کی کیا حقیقت ہے کہ وہ خود کو اس کے اقتدار سے باہر سمجھے۔ (تدبر قرآن۔ ج9۔ ص351 تا353)

نوٹ: 3

جزا و سزا پر شب و روز کے نظام سے استدلال کرنے کے بعد آیات۔ 6 تا 14۔ میں انسانی تاریخ سے استدلال کیا گیا ہے۔ تاریخ کی چند معروف قوموں کے طرزِ عمل اور ان کے انجام کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کائنات کسی اندھے بہرے قانون فطرت (Law of Nature) پر نہیں چل رہی ہے بلکہ ایک خدائے حکیم اس کو چلا رہا ہے۔ اس خدا کی خدائی میں صرف ایک وہی قانون کارفرما نہیں ہے جسے تم قانون فطرت کہتے ہو۔ بلکہ ایک قانون اخلاق بھی کارفرما ہے جس کا لازمی تقاضا مکافاتِ عمل اور جزاء و سزا ہے۔ اس قانون کی کارفرمائی کے آثار خود اس دنیا میں بھی بار بار ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ یہاں جن قوموں نے بھی آخرت سے بے فکر ہو کر اپنی زندگی کا نظام چلایا وہ آخر کار مفسد بن کر رہے اور اس کائنات کے رب نے آخر کار عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ انسانی تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ دو باتوں کی واضح شہادت دے رہا ہے۔ ایک یہ کہ آخرت کا انکار ہر قوم کو بگاڑنے اور بالآخر تباہی میں دھکیلنے کا موجب ہوا ہے۔ اس لیے آخرت فی الواقع ایک حقیقت ہے جس سے ٹکرانے کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو حقیقت سے ٹکرانے کا ہوا کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جزائے اعمال کسی وقت مکمل طور پر بھی واقع ہونے والی ہے۔ کیونکہ فساد کی آخری حد پر پہنچ کر عذاب کا کوڑا جن لوگوں پر برسا، ان سے پہلے صدیوں تک بہت سے لوگ اس فساد کے بیج بو کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان پر کوئی عذاب نہیں آیا تھا۔ خدا کے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی وقت ان سب کی بھی باز پرس ہو اور وہ بھی سزا پائیں۔ (تفہیم القرآن)

آیت نمبر (15 تا 30)

ج	م	م

(ن۔ض) جَمْعًا کسی چیز کا کثرت سے جمع ہونا۔ (لازم)
جَمًّا کسی چیز کو کثرت سے جمع کرنا۔ (متعدی)، زیر مطالعہ آیت۔ 20۔

ترکیب

(آیت۔ 15۔ 16) اِذَا میں غیر معین وقت کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کو مزید غیر معین کرنے کے لیے اس کے ساتھ مَا کا اضافہ کیا گیا ہے۔ (دیکھیں آیت۔ 2/ البقرۃ: 11، نوٹ۔ 1۔ آیت۔ 2/ البقرۃ: 26، نوٹ۔)۔ (آیت۔ 19۔ 20) تَاْكُلُوْنَ کا مفعول مطلق اَكْلًا ہے اور لَمًّا حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ اسی طرح سے تُحِبُّوْنَ، جو باب افعال سے ہے اس کا مفعول مطلق ثلاثی مجرد سے حُبًّا آیا ہے، جبکہ جَمًّا حال ہے۔ (آیت۔ 22) جَاءَ کا فاعل رَبُّكَ بھی ہے اور اَلْمَلَكُ بھی۔ لیکن صَفًّا صَفًّا صرف اَلْمَلَكُ کا حال ہے اور اس پر لام جنس ہے۔ (آیت۔ 25۔ 26) لَا يُعَذِّبُ اور لَا يُوْثِقُ کا فاعل اَحَدٌ ہے۔ عَذَابَهٗ اور وَثَاقَهٗ کی ضمیریں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ (آیت۔ 28)۔ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً یہ دونوں حال ہیں۔

ترجمہ

2004

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ	اِذَا مَا	ابْتَلٰىهُ	رَبُّهٗ	فَاَكْرَمَهٗ
پس وہ جو ہے انسان	(تو) جب کبھی بھی	آزمائش میں ڈالتا ہے اس کو	اس کا رب	تو وہ عزت دیتا ہے اس کو

وَنَعَّمَهٗ ۙ	فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ	اَكْرَمَنِ ۝۱۵	وَاَمَّآ	اِذَا مَا
اور وہ بتدریج نعمت دیتا ہے اس کو	تو وہ (انسان) کہتا ہے میرے رب نے	مہربانی کی مجھ پر	اور وہ جو ہے	(کہ) جب کبھی بھی

ابْتَلٰىهُ	فَقَدَرَ عَلَيْهِ	رِزْقَهٗ ۙ	فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ
وہ آزمائش میں ڈالتا ہے اس کو	تو وہ اندازہ (تنگی) کرتا ہے اس پر	اس کے رزق کا	تو وہ کہتا ہے میرے رب نے

اَهَانَنِ ۝۱۶	كَلَّا بَلْ	لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝۱۷
اہانت کی میری	ہرگز نہیں، بلکہ (بات یہ ہے کہ)	تم لوگ مہربانی نہیں کرتے یتیم پر

وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ	عَلٰي طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۱۸	وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ
اور تم لوگ ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے	مسکین کے کھانا (کھلانے) پر	اور تم لوگ کھاتے ہو میت کا مال

اَكْلًا	لَّمًّا ۝۱۹	وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ	حُبًّا	جَمًّا ۝۲۰
جیسے کھاتے ہیں	سمیٹتے ہوئے	اور تم لوگ محبت کرتے ہو مال سے	جیسا محبت کرنے کا حق ہے	کثرت سے جمع کرتے ہوئے

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ	دَكًّا دَكًّا ۝۲۱	وَّجَآءَ رَبُّكَ	وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝۲۲
ہرگز نہیں، جب ہموار کی جائے گی زمین	کوٹ کوٹ کر	اور آئے گا آپ کا رب	اور سارے فرشتے قطار در قطار

وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ	يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ	وَ	اَنّٰى لَهُ
اور (نزدیک) لائی جائے گی اس دن جہنم	(تب) اس دن یاد کرے گا انسان	اس حال میں (کہ)	کہاں ہوگی اس کے لیے

الذِّكْرٰى ۝۲۳	يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ	لِحَيَاتِيْ ۝۲۴
وہ بڑی نصیحت	(پھر) وہ کہے گا اے کاش میں نے آگے بھیجا ہوتا	اپنی زندگی کے لیے

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ	عَذَابَهٗٓ	اَحَدٌ ۝۲۵	وَّلَا يُوْثِقُ
تو اس دن عذاب نہیں دے (سکے) گا	اس (اللہ) کے عذاب (جیسا)	کوئی ایک بھی	اور نہیں جکڑے گا

وَثَاقَهٗٓ	اَحَدٌ ۝۲۶	يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝۲۷	ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ
اس کا (سا) جکڑنا	کوئی ایک بھی	(پھر کہا جائے گا) اے مطمئن ہونے والی جان	تو واپس چل اپنے رب کی طرف

رَاضِيَةً	مَّرْضِيَّةً ۝۲۸	فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝۲۹	وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝۳۰
راضی ہوتے ہوئے (اپنے رب سے)	پسندیدہ ہوتے ہوئے (اپنے رب کی)	پھر تو داخل (شامل) ہو جا میرے بندوں میں	اور تو داخل ہو جا میری جنت میں

نوٹ: 1 آیات۔15۔16 میں انسان سے مراد اصل میں تو کافر انسان ہے۔ مگر مفہوم عام کے اعتبار سے وہ مسلمان بھی اس خطاب میں شریک ہے جو اس جیسے خیال میں مبتلا ہو۔ اور وہ خیال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اس کے رزق میں وسعت سے نوازے تو شیطان اس کو دو باطل خیالات

میں مبتلا کرتا ہے۔ اول یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ میری ذاتی صلاحیت، عقل وفہم اور محنت کا نتیجہ ہے جو مجھے ملنا ہی چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ان چیزوں کے اصل ہونے سے وہ سمجھ بیٹھے میں اللہ کے نزدیک بھی مقبول ہوں۔ اسی طرح سے جب کسی انسان پر رزق میں تنگی آئے تو اس کو اللہ کے نزدیک مردود ہونے کی دلیل سمجھے۔ ایسے خیالات کفار ومشرکین میں تو ہوتے ہی ہیں، مگر افسوس ہے کہ آج کل بہت سے مسلمان بھی اس گمراہی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ (معارف القرآن)

اس دنیا میں انسان کو تنگی کی حالت پیش آئے یا فراخی کی، یہ دونوں ہی بطور امتحان پیش آتی ہیں۔ کسی کو فراخی بخشنے سے مقصود اس کے شکر کو جانچنا ہوتا ہے کہ نعمتیں پاکر وہ مغرور بن جاتا ہے یا اپنے رب کا شکر گزار اور اُس کے بندوں کا خدمت گزار بنتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا رزق تنگ کرتا ہے تو اس سے مقصود اس کے صبر کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کے فیصلے پر قانع ومطمئن اور اپنے کردار میں پختہ ثابت ہوتا ہے یا حوصلہ ہار دیتا ہے۔ انسان کے صبر وشکر کی پختگی ہی پر اس کے تمام دین کی پختگی کا انحصار ہے، اس لیے ان دونوں چیزوں کا امتحان برابر ہوتا رہتا ہے۔ جس نے اپنے اندر یہ دونوں صفات پیدا کرلیں، اس کو نفس مطمئنہ کی دولت حاصل ہوگئی اور اسی کو اللہ تعالیٰ کے ہاں رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کی بادشاہی حاصل ہوگی۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:2

آیت۔24۔ میں الفاظ ہیں جَاءَ رَبُّكَ۔ ان کا لفظ ترجمہ ہے ''تیرا رب آئے گا۔'' لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کو ایک تمثیلی انداز بیان ہی سمجھنا ہوگا۔ جس سے یہ تصور دلانا مقصود ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور اس کی سلطانی کے آثار اس طرح ظاہر ہوں گے جیسے دنیا میں کسی بادشاہ کے تمام لشکروں کی آمد سے وہ رعب طاری نہیں ہوتا جو بادشاہ کے خود دربار میں آجانے سے طاری ہوتا ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

آیات۔25۔26 کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دن مجرموں کو ایسی سخت سزا دے گا اور ایسی سخت قید میں رکھے گا کہ کسی دوسرے کی طرف سے اس طرح کی سختی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ ''اس روز نہ مارے گا اس کو سامارنا کوئی، نہ آگ نہ دوزخ کے مؤکل، نہ سانپ بچھو، جو دوزخ میں ہوں گے۔ کیونکہ ان کا مارنا اور دکھ دینا عذاب جسمانی ہے۔ اور حق تعالیٰ کا عذاب اس طور سے ہوگا کہ مجرم کی روح کو حسرت اور ندامت میں گرفتار کردے گا، جو عذاب روحانی ہے، اور ظاہر ہے کہ عذاب روحانی کو عذاب جسمانی سے کیا نسبت۔ نیز نہ باندھے گا اس کا سا باندھنا کوئی۔ کیونکہ دوزخ کے پیادے ہر چند کو دوزخیوں کے گلے میں طوق ڈالیں گے، زنجیروں سے جکڑیں گے اور دوزخ کے دروازے بند کرکے اوپر سے سرپوش رکھ دیں گے لیکن ان کی عقل اور خیال کو بند نہ کرسکیں گے۔ اور عقل وخیال کی عادت ہے کہ بہت سی باتوں کی طرف التفات کرتا ہے اور ان میں سے بعض باتیں دوسری باتوں کے لیے حجاب ہوجاتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ عقل وخیال کو ادھر ادھر جانے سے روک دے گا اور بالکل ہمہ تن دکھ درد ہی کی طرف متوجہ رکھے گا۔ تو ایسی قید بدنی قید سے ہزاروں درجے سخت ہے۔

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:4

نفس مطمئن سے مراد انسان ہے جس نے کسی شک وشبہ کے بغیر پورے اطمینان اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اللہ وحدہٗ لاشریک کو اپنا رب اور انبیاء کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین قرار دیا ہے۔ جو عقیدہ اور جو حکم بھی اللہ اور اس کے رسول سے ملا اسے سراسر حق مانا۔ جس چیز سے بھی اللہ کے دین نے منع کیا اسے بادل ناخواستہ نہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ چھوڑا کہ فی الواقع وہ بُری چیز ہے۔ حق پرستی کی راہ میں جس قربانی کی بھی ضرورت پیش کردی۔ جن مشکلات، تکالیف اور مصائب سے بھی اس راہ میں سابقہ پڑا، انہیں پورے سکون قلب کے ساتھ برداشت کیا اور

2004

دوسرے راستوں پر چلنے والوں کو اس دنیا میں جو فوائد منافع اور لذتیں حاصل ہوتی ہیں ان سے محروم رہ جانے پر اسے کوئی حسرت لاحق نہیں ہوئی، بلکہ وہ اس بات پر پوری طرح مطمئن رہا کہ دین حق کی پیروی نے اسے ان گندگیوں سے محفوظ رکھا ہے۔ (تفہیم القران)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ البلد (90)

آیت نمبر (1 تا 20)

ک ب د

(س) كَبْدًا درد جگر میں مبتلا ہونا۔ تکلیف برداشت کرنا۔

كَبَدٌ اسم ذات ہے۔ سختی، مشقت، زیر مطالعہ آیت۔4۔

ش ف ھـ

(ف) شَفْهًا ہونٹ پر مارنا۔

شَفَةٌ اسم ذات ہے۔ ہونٹ۔ تثنیہ شَفَتَانِ۔ شَفَتَيْنِ۔ جمع شِفَاهٌ اور شَفَهَاتٌ۔ (یہ دراصل شَفَهَةٌ ہے۔ اہل زبان اس کی ھا گرا کر شَفَةٌ بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جمع میں اس کی ھا واپس آجاتی ہے)۔ زیر مطالعہ آیت۔9

ن ج د

(ن) نُجُوْدًا ظاہر ہونا واضح ہونا۔

نَجْدٌ اسم ذات ہے۔ بلند راستہ۔ واضح راستہ۔ زیر مطالعہ آیت۔10۔

س غ ب

(س) سَغَبًا وَمَسْغَبَةً بھوکا ہونا۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ء ص د

x x ثلاثی مجرد سے فعل نہیں آتا۔

(افعال) اِيْصَادَ دروازہ یا ڈھکن بند کرنا۔

مُؤْصَدٌ اسم المفعول ہے۔ بند کیا ہوا۔ سربمہر کیا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت۔20

ترکیب

(آیت۔5 (يَحْسَبُ میں شامل هُوَ کی ضمیر فاعلی اَلْاِنْسَانَ کے لیے ہے۔ (آیت۔13) فَكُّ رَقَبَةٍ مرکب اضافی ہے اور خبر ہے۔ اس کا مبتداھِیَ محذوف ہے (آیات۔14۔16) اِطْعَامٌ مصدر ہے۔ اس نے فعل کا کام کیا ہے اور يَتِيْمًا اور مِسْكِيْنًا کو نصب دی ہے۔ (دیکھیں آیت۔3/آل عمران:54، نوٹ۔1)۔ نَارٌ نکرہ مخصوصہ ہے اور مُؤْصَدَةٌ اس کی خصوصیت ہے۔

2004

ترجمہ

لَآ اُقۡسِمُ	بِهٰذَا الۡبَلَدِ ①	وَاَنۡتَ حِلٌّۢ	بِهٰذَا الۡبَلَدِ ②
نہیں میں قسم کھاتا ہوں	اس شہر کی	اور آپ کو حلال (سمجھا) (کفار مکہ نے)	اس شہر میں

وَوَالِدٍ	وَّمَا وَلَدَ ③	لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ	فِيۡ كَبَدٍ ④
اور قسم ہے جننے والے کی	اور اس کی جو اس نے جنا	بیشک ہم نے پیدا کیا ہے انسان کو	ایک مشقت میں

اَيَحۡسَبُ	اَنۡ لَّنۡ يَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ	اَحَدٌ ⑤	يَقُوۡلُ اَهۡلَكۡتُ	مَالًا لُّبَدًا ⑥
کیا وہ (انسان) سمجھتا ہے	کہ ہرگز قابو نہیں پائے گا اس پر	کوئی ایک بھی	وہ کہتا ہے میں نے ہلاک کیا (خرچ کیا)	ڈھیروں ڈھیر مال

اَيَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ يَرَهٗۤ	اَحَدٌ ⑦	اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ	عَيۡنَيۡنِ ⑧
کیا وہ سمجھتا ہے کہ دیکھا ہی نہیں اس کو (کماتے خرچ کرتے)	کسی ایک نے بھی	کیا ہم نے نہیں بنائیں اس کے لیے	دو آنکھیں

وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِ ⑨	وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ⑩	فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ⑪	وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ⑫
اور ایک زبان اور دو ہونٹ	اور ہم نے سمجھا دیئے اس کو دونوں راستے	پس وہ نہیں گھسا اُس گھاٹی میں	اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ گھاٹی

فَكُّ رَقَبَةٍ ⑬	اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِيۡ يَوۡمٍ	ذِيۡ مَسۡغَبَةٍ ⑭	يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ⑮	اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ⑯
(وہ) کسی گردن کا چھڑانا ہے	یا کھلانا ہے کسی ایسے دن میں جو	بھوک والا ہو	کسی ایک یتیم کو جو قربت والا ہو	یا کسی ایسے مسکین کو جو محتاجی والا ہو

ثُمَّ كَانَ	مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا	وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ	وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ ⑰	اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ ⑱
پھر وہ ہو (بھی)	ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے	اور باہم تاکید کی ثابت قدم رہنے کی	اور باہم تاکید کی رحم دل ہونے کی	وہ لوگ داہنی طرف والے

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِنَا	هُمۡ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ ⑲	عَلَيۡهِمۡ نَارٌ	مُّؤۡصَدَةٌ ⑳
اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا	وہ بائیں طرف والے ہیں	ان پر ایک ایسی آگ ہے جو	اوپر سے بند کی ہوئی ہے

نوٹ:1

اس سورہ میں ایک بہت بڑے مضمون کی چند مختصر جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اور یہ قرآن کا کمال اعجاز ہے کہ ایک پورا نظریۂ حیات، جسے مشکل سے ایک ضخیم کتاب میں بیان کیا جا سکتا تھا، اسے اس چھوٹی سی سورہ کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں نہایت مؤثر طریقہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کا موضوع دنیا میں انسان کی، اور انسان کے لیے دنیا کی صحیح حیثیت سمجھانا اور یہ بتانا ہے کہ خدا نے انسان کے لیے سعادت اور شقاوت (نیک بختی اور بدبختی) کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیئے ہیں، ان کے دیکھنے اور ان پر چلنے کے وسائل بھی اسے فراہم کر دیئے ہیں۔ اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر موقوف ہے کہ وہ سعادت کی راہ پر چل کر اچھے انجام کو پہنچتا ہے یا شقاوت کی راہ اختیار کر کے برے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔2۔ میں لفظ حِلٌّ میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حلول سے مشتق ہو، جس کے معنے کسی شئے کے اندر سمانے اور رہنے اور اترنے کے آتے ہیں۔ اس اعتبار سے حِلٌّ کے معنے اترنے اور رہنے کے ہوں گے اور مراد آیت کی یہ ہوگی کہ شہر مکہ خود بھی محترم ہے اور آپ ﷺ بھی اس شہر میں رہتے ہیں۔ اس لیے شہر کی عظمت وحرمت دوہری ہوگئی۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ لفظ حِلٌّ مصدر حِلّت سے مشتق ہو جس کے معنے کسی چیز کی حلال ہونے کے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ﷺ کو کفار مکہ نے حلال سمجھ رکھا ہے۔ جس

مقدس مقام پر کسی جانور کا قتل بھی جائز نہیں ہے، اور ان لوگوں کا بھی یہی عقیدہ ہے، وہاں ان لوگوں نے اللہ کے رسول ﷺ کا قتل حلال سمجھ لیا ہے۔ دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ ﷺ کے لیے حرمِ مکہ میں قتالِ کفار حلال ہونے والا ہے جیسا کہ فتح مکہ میں ایک روز کے لیے کفار کا قتل حلال کر دیا گیا تھا۔ مظہری میں تینوں احتمال مذکور ہیں۔

آیت۔ 3۔ میں والد سے مراد حضرت آدمؑ ہیں اور مَا وَلَدَ سے ان کی اولاد مراد ہے جو ابتدائے دنیا سے قیامت تک ہو گی۔ آگے جواب قسم مذکور ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے ایسا پیدا کیا گیا ہے کہ اوّل عمر سے آخر تک محنتوں اور مشقتوں میں رہتا ہے۔ اس قسم اور جواب قسم میں انسان کو اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہاری یہ خواہش کہ دنیا میں ہمیشہ راحت ہی راحت ملے اور کسی تکلیف سے سابقہ نہ پڑے، ایک خیال خام ہے جو کبھی حاصل نہیں ہو گا۔ ہر شخص کو دنیا میں محنت و مشقت اور رنج و مصیبت ضروری پیش آتی ہیں۔ اور جب ان کو پیش آنا ہی ہے تو عقلمند کا کام یہ ہے کہ اس چیز کے لیے مشقت جھیلے جو ہمیشہ اس کے کام آئے اور دائمی راحت کا سامان ہے۔ اور یہ صرف ایمان اور طاعت حق میں منحصر ہے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔6۔ میں یہ نہیں کہا کہ میں نے ڈھیر سا مال خرچ کر دیا، بلکہ اَهْلَكْتُ کہا ہے جس کے معنی ہیں کہ میں نے ڈھیر سا مال ہلاک کر دیا یعنی لٹا دیا یا اڑا دیا۔ اور یہ مال اڑا دینا کس مد میں تھا۔ کسی حقیقی نیکی کے کام میں نہیں، جیسا کہ آگے کی آیات سے خود بخود ظاہر ہو رہا ہے بلکہ اپنی دولت مندی کی نمائش اور فخر کے اظہار میں تھا۔ شادی اور غمی کی رسموں میں سینکڑوں آدمیوں کی دعوت کرنا، جوئے میں دولت ہار دینا، جوا جیت جانے پر اونٹ پر اونٹ کاٹنا اور یار دوستوں کو خراب کھلانا، میلوں میں بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ جانا اور دوسرے سرداروں سے بڑھ کر شان و شوکت کا مظاہرہ کرنا۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے نمائشی اخراجات تھے جنہیں جاہلیت میں آدمی کی فیاضی کی علامت اور اس کی بڑائی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ انہی پر اس کی تعریفوں کے ڈنکے بجتے تھے اور وہ خود بھی ان پر اپنا فخر جتاتے تھے۔

لیکن یہ فخر جتانے والا یہ نہیں سمجھتا کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو دیکھ رہا ہے کہ اس نے کن ذرائع سے یہ دولت حاصل کی، کن کاموں میں اسے کھپایا اور کن اغراض و مقاصد کے لیے اس نے یہ سارے کام کیے۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ خدا کے ہاں اس فضول خرچی، اس شہرت طلبی اور اس تفاخر کی کوئی قدر ہو گی۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:4

آیات۔8۔9۔ کا مطلب یہ ہے کہ کیا ہم نے اسے علم و عقل کے ذرائع نہیں دیئے۔ دو آنکھوں سے مراد گائے اور بھینس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں ہیں جنہیں کھول کر آدمی دیکھے تو اسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں جو حقیقت کا پتہ دیتے ہیں۔ اور صحیح و غلط کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مراد محض بولنے کے آلات نہیں ہیں بلکہ نفس ناطقہ جو ان آلات کی پشت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا ہے۔ پھر انسان ان سے اظہارِ مافی الضمیر کا کام لیتا ہے۔

پھر آیت۔10۔ میں فرمایا کہ ہم نے محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے انسان کو چھوڑ نہیں دیا کہ وہ اپنا راستہ خود تلاش کرے۔ بلکہ اس کی رہنمائی بھی کی۔ اس کے سامنے بھلائی اور برائی، نیکی اور بدی، دونوں کے راستے نمایاں کر کے رکھ دیئے تا کہ وہ سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اختیار کر لے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ دھر میں فرمائی گئی ہے کہ ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا۔ خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:5

آیت۔ 11۔ میں اَلْعَقَبَةَ آیا ہے۔ عقبہ پہاڑ کی بڑی چٹان کو بھی کہتے ہیں اور دو پہاڑوں کے درمیانی راستے یعنی گھاٹی کو

بھی۔ دشمن سے نجات حاصل کرنے میں یہ عقبہ انسان کی مدد کرتا ہے کہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر دشمن سے اپنے آپ کو بچالے یا پھر گھاٹی میں داخل ہو کر کہیں نکل جائے۔ اس جگہ طاعات وعبادات کو عقبہ سے تعبیر فرمایا ہے جس طرح عقبہ دشمن سے نجات دلانے کا سبب ہوتا ہے اسی طرح اعمال صالحہ آخرت کے عذاب سے نجات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ پھر ان اعمال صالحہ میں پہلے فرمایا کسی غلام (یا مقروض) کو آزاد کرنا۔ یہ بہت بڑی عبادت ہے اور ایک انسان کی زندگی کو سنوار دینا ہے۔ دوسری چیز بیان فرمائی بھوکے کو کھانا کھلانا۔ کسی کو بھی کھانا کھلایا جائے وہ ثواب سے خالی نہیں ہے، لیکن جب کسی ایسے یتیم کو کھلایا جائے جس کے ساتھ رشتہ داری بھی ہے تو اس میں دوہرا ثواب ہو گیا۔ ایک بھوکے کا پیٹ بھرنا دوسرے صلہ رحمی کا حق ادا کرنا۔ اگر یتیم رشتہ دار نہ ہو تو ایسا مسکین ہو جو محتاج ہو۔ (معارف القرآن)

نوٹ: 6 آیت۔ 17۔ کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ اوصاف کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ آدمی مومن بھی ہو۔ کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل نہ تو عمل صالح ہے اور نہ وہ اللہ کے ہاں مقبول ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اس کی تصریح کی گئی ہے کہ نیکی وہی قابل قبول اور ذریعہ نجات ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔ مثلاً سورۂ نساء کی آیت۔ 124۔ میں فرمایا کہ جو نیک اعمال کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور (اس حال میں کہ) ہو وہ مومن، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ سورۂ نحل کی آیت۔ 97۔ میں فرمایا کہ جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور (اس حال میں کہ) ہو وہ مومن، تو ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ایسے لوگوں کو ان کا اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق عطا کریں گے۔ جو شخص بھی قرآن پاک کا مطالعہ کرے گا وہ یہ دیکھے گا کہ اس کتاب میں جہاں بھی عمل صالح کے اجر کا ذکر ہے وہاں لازماً اس کے ساتھ ایمان کی شرط لگی ہوئی ہے۔ ایمان کے بغیر عمل کو قرآن میں کہیں بھی اللہ کے ہاں مقبول نہیں قرار دیا گیا اور نہ اس پر کسی اجر کی امید دلائی گئی۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الشمس (91)

آیت نمبر (1 تا 15)

ط ح ی

(ض) طَحۡیًا کسی چیز کو پھیلانا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 6۔

ل ھ م

(س) لَھۡمًا کسی چیز کو ایک ہی مرتبہ میں نگل جانا۔ ہڑپ کر جانا۔

(افعال) اِلۡھَامًا نگلوانا۔ کسی کے دل میں کوئی بات القا کر دینا۔ (لیکن یہ لفظ ایسی بات کے القا کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے جو اللہ تعالیٰ یا ملاء اعلیٰ کی جانب سے دل میں ڈالی جاتی ہے۔ مفردات) زیر مطالعہ آیت۔ 8۔

ترکیب آیات۔ 5 تا 7 میں مَا کا لفظ آیا ہے۔ اس کو مصدریہ بھی مانا گیا ہے اور موصولہ بھی۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ ذوی عقول کے لیے مَنۡ موصولہ آتا ہے اور غیر ذوی عقول کے لیے مَا آتا ہے۔ لیکن عربی میں کبھی کبھی مَا بھی ذوی عقول کے لیے آجاتا ہے۔ یعنی کبھی مَا بھی مَنۡ کے معنی میں آجاتا